FICTION HOUSE

آوازِ عصر

تجزیاتی مضامین

ارشد محمود

آوازِ عصر تجزیاتی مضامین

ارشد محمود

آوازِ عصر

آوازِ عصر

(تجزیاتی مضامین)

ارشد محمود

فکشن ہاؤس
لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com.

مصنف کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

نام کتاب : آوازِ عصر (تجزیاتی مضامین)
مصنف : ارشد محمود
اہتمام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : فکشن ہاؤس، لاہور
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : سعید ابراہیم
اشاعت : 2017ء
قیمت : -/300 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68-مزنگ روڈ لاہور،فون: 042-36307550-1,37249218

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدرآباد،فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی،فون: 021-32603056

لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

فہرست

مختصر مضامین

دیباچہ

15 سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا، کہ میری نئی کتاب نہ آ سکی۔ قارئین، چاہنے والے اور پبلشرز کا اس دوران اصرار رہا کہ میں کوئی نئی کتاب مارکیٹ میں لے کر آوں۔ میری پہلی تینوں کتابیں خاص موضوعات پر مبنی تھی۔ مجھے خوشی ہے، وقت کے ساتھ ان کی دن بدن مقبولیت اور پذیرائی بڑھتی جا رہی ہے۔ جس سے میرے چاہنے اور پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع ہوتا گیا ہے۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا تھا۔ کہ میں اپنے معاشرے اور ملک کے لئے جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اور جسے اس کی ضرورت ہے، وہ میں اپنی تین کتابوں میں کہہ چکا ہوں۔ میری قوم مذہب زدگی کا شکار ہے۔ ''تصورِ خدا'' لکھ دی۔ میری قوم ثقافتی اور اخلاقی لحاظ سے پس ماندہ سوچ اور قدامت پسند اقدار کی حامل ہے۔ ''ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ'' لکھ دی۔ میری قوم پڑھ لکھ کر بھی ذہنی طور پر جاہل کی جاہل رہتی ہے، ''تعلیم اور ہماری قومی الجھنیں'' لکھ دیں۔ چاہئے تو یہ تھا، میری کتابیں اتنے برسوں کے بعد ایکسپائر ہو جاتی۔ لیکن داد دینی چاہئے پاکستانی حکمران اشرافیہ کے ڈھیٹ پن کی، کہ وہ ہر آن بدلتی دنیا میں پاکستان کے حالات کو بدلنے نہیں دیتے۔ کوئی اور مناسب موضوع مجھے سوجھ نہیں رہا تھا۔ جس پر کتابی مواد میں بات کی جا سکے۔

اب یہ متفرق مضامین کا مجموعہ پیش خدمت ہے۔ اس میں متنوع موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس میں کئی مضامین عرصہ پہلے مختلف جرائد و رسائل میں چھپ چکے

تھے۔ یہ مجتمع اور محفوظ ہو گئے ہیں۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے متعارف ہونے کے بعد ہم
جیسے پڑھنے لکھنے والوں کو اظہار کے جدید میدان میسر آ گئے۔ جہاں کہنے اور لکھنے کی آزادی
میسر ہے۔ سنسر نہیں، کوئی ایڈیٹر نہیں۔ آپ کی بات اسی لمحے دنیا کے کونے کونے میں بیٹھے
ہزاروں لوگوں تک پہنچ جاتی ہے۔ چند سال پہلے جب سوشل میڈیا میں کام شروع کیا۔ تو کئی
دوستوں نے اسے اپنی انرجی اور صلاحیت کا ضیاع قرار دیا۔ لیکن وقت اور تجربے نے
ثابت کیا، کہ معلومات پہنچانے، نئے خیالات کی ترویج اور رائے عامہ بدلنے میں سوشل
میڈیا (فیس بک) ایک نہایت موثر آلہ ہے۔ تیزی کے ساتھ روشن خیال اور آزاد فکر لوگوں
کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان کا پڑھا لکھا طبقہ ملائیت اور مذہب زدگی سے تنگ
آ چکا ہے۔ بہت اچھا لکھنے اور فکری انقلاب برپا کرنے والے سامنے آ رہے ہیں۔ جن
کو ایک دوسرے کے ذریعے باہمی حوصلہ مل رہا ہے۔

اس کتاب میں کچھ مختصر مضامین شامل ہیں، جو دراصل فیس بک پر پوسٹ کی شکل میں
دیئے گئے تھے۔ ہمارے ہاں کے تعلیمی نصاب اور میڈیا نے بہت سے فکری مغالطے،
کلیشے اور جھوٹ پھیلا رکھے ہیں۔ جن کو توڑنا اور ان کی وضاحت کرنا ضروری ہے، تا کہ
سوچ، فکر اور آئیڈیاز ابہام سے پاک ہو سکیں۔ جیسا کہ میرے پڑھنے والے جانتے ہیں۔
میری تمام تحریروں کا مقصد پاکستان اور اپنے معاشرے کو خوشحال، مہذب اور انسان
دوست بنانا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ امید ہے خاص طور پر نوجوان نسل کو
میرے ان مضامین سے فکری کشادگی میسر آئے گی۔

ارشد محمود

جنسی تنوع اور فطرت

ہمارے ہاں جنس (سیکس) ایک ممنوعہ موضوع ہے، اس مضمون میں ہم دیکھیں گے، فطرت
میں جنسی ملاپ کتنے تنوع میں پایا جاتا ہے۔ جب کہ انسانی معاشروں میں مذہب کے نام پر
مخصوص شرائط کے ساتھ جنسی ملاپ کی اجازت ہے۔ ورنہ دردناک سزائیں تجویز کر رکھی ہیں۔
راقم کو نیویارک میں واقع جنس کا عجائب گھر (SEX MUSEUM) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ترقی
یافتہ قوموں کے لیے عجائب گھر اتنے ہی ضروری ہیں، جیسے ان کی یونیورسٹیاں۔ یورپ میں کوئی
بستی، شہر، قصبہ ایسا نہیں ہوتا، جہاں کسی نہ کسی طرح کے متعدد میوزیم نہ ہوں۔ میوزیم ان قوموں
کے نزدیک تعلیم عامہ (Public Education) کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہم جیسی قوموں کو میوزیم
اور لائبریریاں نہیں جگہ جگہ چند فرلانگ کے فاصلے پر مساجد، درگاہ، مزار درکار ہوتے ہیں۔ اس
کے بعد ہمارا دعوی ہوتا ہے، ہم دنیا کی سب قوموں سے زیادہ سچائی کو جانتے ہیں۔ مذکورہ میوزیم
جنس کے لاتعداد پہلوؤں پر علمی روشنی ڈالتا ہے۔ وہاں جنس سے متعلقہ کوئی بھی موضوع حرام نہیں
تھا۔ انہوں نے انسان اور فطرت کو بالکل ننگا کر کے دکھایا ہوا تھا۔ ایک طرف فطرت تھی، حیوانی
دنیا پر ایک وسیع سائنسی تحقیق اور معلومات تھی، دوسری طرف انسان کی جنسی دلچسپیاں اور جنسی
رویوں پر سیر حاصل تصویری، ویڈیو، تحریریں معلومات تھی۔ وہاں انسانی اور حیوانی مجسمے بھی پڑے
تھے۔ جو ان کے جنسی اعضا اور جنسی رویوں کو واضح کر رہے تھے۔ راقم جب اس میوزیم سے باہر
نکلا، تو کئی حیرت زدہ سوال ذہن میں گھومتے محسوس ہوئے۔

ہمارے اپنے جسم کو سمجھنے میں طبی علم کا اثر رہا ہے۔ جسے استعمال کر کے ہم جنس کے بارے
میں اپنے ثقافتی رویوں کے لیے قواعد وضوابط بناتے رہے ہیں۔ ابتدائی زمانے میں انسان کا جنسی
تجسس اور تحقیق علم حیاتیات، تشریح اعضاء، افزائش یعنی بچے کی پیدائش کے حوالے سے تھی۔ اسی

کے ساتھ اخلاقیات، عصمت وعفت اور جنسی ضوابط کے معاملات بھی چلتے رہے۔ جنسی طور پر خراب ہونے کا مطلب خودلذتی اور ہم جنسیت کو قرار دیا گیا اور ان کے لیے سزائیں تجویز کی گئی۔ فطری اور صحت مندانہ جنس کیا ہے۔ اور پھر کس کے ساتھ، اور کس وقت آپ سیکس کر سکتے ہیں، کو متعین کیا جانے لگا۔

میوزیم میں کئی باتوں کو تاریخی پس منظر میں بتایا گیا ہے۔ مثلاً مصنوعی جنسی آلات (Vibrators) کے بارے بتایا گیا، کہ ان کو بیسویں صدی کے شروع میں ماہرین نفسیات استعمال کرتے تھے۔ اس سے قبل جن عورتوں کو ہسٹریا کا دورہ پڑتا تھا، ڈاکٹر اس مریضہ کی جائے مخصوصہ پر اپنے ہاتھوں سے رگڑ پیدا کر کے اس کی جنسی تسکین کرانے میں مدد کیا کرتے تھے۔ پھر اس کام کے لیے آلات بن گے۔ جو بعد میں پورنوگرافی کے عام ہونے سے یہ اپنی ذاتی لذت کے لیے بھی استعمال ہونے لگے۔ خودلذتی کے بارے میں بتایا گیا کہ اس کا مسئلہ سماجی سطح پر اس وقت اٹھا، جب ایک کتاب چھپی، جس کا عنوان تھا، خودخرابی کا گناہ کبیرہ (Heinous sin of self pollution)۔ جس میں خودلذتی کو کراہت آمیز فعل قرار دیا گیا۔ اور اس کے اثرات کو دور کرنے کے لیے ایک شربت (ٹانک) بھی تجویز کیا گیا تھا۔ (جس کا مطلب لوگوں کو خوفزدہ کر کے پیسہ کمانا تھا)۔ اس کا پس منظر یہ تھا، کہ بائبل میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ خدا نے ایک انسان کو سزا دی، کہ اس نے اپنا بیج بہا دیا یہ کتاب پورے یورپ میں بڑی مقبول ہوئی۔ اور مشت زنی کو روکنے والی کئی دوائیوں کی ایجاد کے دعوے ہونے لگے۔ ڈاکٹروں اور مفکروں نے بھی خودلذتی کے سماجی اثرات پر خوب لکھا۔ جس میں روسو، کانٹ اور فرائڈ شامل ہیں۔ یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی، کہ ناشتہ میں کارن فلیکس کا مشہور برانڈ Kellogg شروع میں خودلذتی کے برے اثرات سے بچنے کے لیے بنایا گیا تھا!!!

جدید تحقیق سے کئی چیزیں سامنے آئی ہیں، جس سے پرانے نظریات ٹوٹ گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا تھا، کہ ایک Organism اپنی زندگی میں نر ہوتا ہے، یا مادہ۔ جب کہ پودوں میں اور تقریباً آدھی حیوانی دنیا میں Organism ایک ساتھ نر بھی ہوتا ہے، اور مادہ بھی۔ اور وہ اپنی زندگی میں اس کا رول بدلتا بھی رہتا ہے۔ دوسری یہ غلط فہمی ہے کہ نر ہمیشہ مادہ سے بڑا ہوتا ہے۔ بہت سی species میں مثلاً مچھلیوں میں مادہ نر سے بڑے سائز میں ہوتی ہیں۔ یہ بھی غلط ہے، کہ

صرف مادہ ہی بچے جنم دیتی ہے جب کہ بہت سی Species میں نہ صرف نر انڈوں پر بیٹھتا ہے، بلکہ وہ گھونسلا بھی بناتا ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ صرف جنسی لحاظ سے دو ہی اصناف ہیں۔ کئی Species میں تین اور تین سے زیادہ بھی اصناف پائی جاتی ہیں۔ یہ غلط ہے کہ قدرت نے صرف نر اور مادہ ہی پیدا کیا ہوا ہے، بلکہ ان کے درمیان سیکس کا عمل بھی ایک سے زیادہ طریقوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ بھی غلط ہے، کہ نر اور مادہ کی شکلوں میں فرق ہوتا ہے۔ نہیں۔ کئی Species میں نر اور مادہ کی پہچان میں امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ بات بھی غلط ہے، کہ نر کا جنسی عضو Penis ہوتا ہے۔ اور مادہ کا Lactates۔ کچھ Species میں مادہ کا بھی جنسی عضو Penis کی شکل کا ہی ہوتا ہے۔ اور کئی نر میں دودھ پیدا کرنے والے Glands ہوتے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے، کہ نر مادہ کو کنٹرول کرتا ہے۔ کئی Species میں مادہ نر کو کنٹرول کرتی ہیں۔ جنسی ملاپ نر اور مادہ کے درمیان Dynamic Interaction ہوتا ہے۔ مادہ ہو سکتی ہے، Dominant نر کو پسند کرے یا نہ کرے۔ یہ بھی غلط ہے، کہ مادہ یک زوجگی چاہتی ہے، اور نر کثیرالزوجگی۔ کئی Species میں کوئی ایک یا دونوں یک زوجگی کے قائل نہیں ہوتے۔ اور زندگی بھر کی یک زوجگی تو بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ حتی کے ان میں بھی جو عام طور پر یک زوجہ Species ہیں۔

جانوروں میں سیکس کے بدلے میں اپنے جنسی ساتھی کو تحفہ (زیادہ تر کھانے کی چیز) پیش کرنے کے بھی مظاہرے دیکھے جا سکتے ہیں۔ جسے بعض محققین نے اسے جانوروں میں Prostitution کا نام دیا ہے۔ نر Macaques کو دیکھا گیا ہے کہ اگر اس کے پاس کم مادہ ہوں، تو وہ کسی ایک کے ساتھ جنسی ملاپ سے پہلے کا پیار زیادہ کرتا ہے۔ حیوانی دنیا کے بارے میں ہمارا بڑھتا علم بتاتا ہے، کہ جانوروں کے اندر حیران کن جنسی طریقے اور رویے رائج ہیں۔ جانور بھی Foreplay کرتے ہیں۔ چومتے ہیں، گلے لگاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو جنسی ہیجان پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اور جنسی ملاپ کے ایسے ایسے طریقے کرتے ہیں، جو ہمارے تصور میں بھی نہیں آ سکتے۔ چنانچہ سیکس جتنا انسانی دنیا میں پیچیدہ عمل ہے۔ اور جنسی لذت صرف انسانی دنیا تک محدود نہیں ہے۔ اس نے ہمارے لیے تحقیق کے کئی در کھول دیے ہیں، کہ Non Reproductive Sex ممکن ہے، اس کا ارتقائی عمل میں کوئی معاون کردار ہو۔ جانوروں میں بھی کئی ایسے ہوتے ہیں، جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ جنسی ساتھی پھانس لیتے ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں۔چین کے پانڈا(جانور) نے دنیا میں شہرت حاصل کر رکھی ہے۔اس کی نسل کو بچانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔اس سلسلے میں جو مشکلات آرہی ہیں وہ ان کا جنس کے بارے میں شرم وحیا کا دخل ہے۔مادہ پانڈا کے پاس تین دن ہوتے ہیں، جب وہ حاملہ ہونے کے قابل ہوتی ہے۔لیکن نر پانڈہ دوسروں کے سامنے جنسی فعل میں نہیں جاتا۔چنانچہ اس کی قوت باہ اور جنسی اشتعال کو بڑھانے کے لیے انھیں پانڈوں کے جنسی فعل میں مبتلا ہونے کی بلو فلمیں دکھائی جارہی ہیں!!!چڑیا گھروں میں پانڈوں کو لائیو جنسی فلموں کے ذریعے ان کو سیکس ایجوکیشن دی جاتی ہے۔تاکہ ناتجربہ کار اور جنسی فعل کی طرف نہ راغب ہونے والے نر پانڈوں میں جنسی اشتہا پیدا کی جاسکے۔پانڈہ کو چین اپنے لیے فخر قرار دیتا ہے۔اس کی نسل میں کمی ماحولیاتی بربادی اور اس کی کم شرح پیدائش بڑی وجوہات ہیں۔چین پانڈہ کو سفارتی سطح پر خیر سگالی کے لیے بھی استعمال کرتا ہے۔ایک پانڈہ کی دوسرے ملک کو ٹرانسپورٹ کرنے کے لیے ایک ملین ڈالر کا خرچ آجاتا ہے۔

علم حیاتیات کی رو سے جانداروں اور پودوں میں اتنا تنوع پایا جاتا ہے۔کہ نر اور مادہ کے لحاظ سے صنفی تقسیم بہت ہی مشکل ہو جاتی ہے، اس لیے کہ ایسی بے شمار Species ہیں، جہاں Hermaphrodites یعنی نر اور مادہ کی دونوں خصلتیں ایک ساتھ پائی جاتی ہیں۔ہم نے جنسی صنفی پیچیدگی کو عورت اور مرد میں تقسیم کر کے بہت سادہ بنا دیا ہے۔جب کہ حقیقت ایسی نہیں۔Parthenogensis ایک ایسا عمل ہے، جہاں پیدائش کسی بھی جنسی فعل کے بغیر ہوتی ہے۔جہاں مادہ ہی مادہ کو جنم دیتی ہے۔جو Genetical Identical یعنی جین بالکل ماں جیسے ہوتے ہیں۔ہم انہیں کلون بھی کہہ سکتے ہیں۔اس طرح کی پیدائش چھپکلی اور سانپوں کی قسموں میں دیکھی گئی ہیں۔اس طرح کے کئی واقعات چڑیا گھروں میں دیکھے گے ہیں، کہ مادہ نے مادہ کو ہی جنم دے دیا ہے، جہاں سب مادہ ہی مقید تھیں۔یعنی نر کے ساتھ ملاپ ہی نہیں ہوا۔

فطرت کے اندر جنسی ہم نوع خوری (Sexual Cannibalism) بھی پائی جاتی ہے۔جس میں مادہ جنسی فعل کے دوران یا اس کے فوری بعد نر کو کھا جاتی ہے۔جیسے ہم جانداروں کے اندر پائے جانے والے کئی طرح کے جنسی رویوں کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔اسی طرح ہم اس عجیب وغریب جنسی نوع خوری پر بھی حیران ہوں گے۔لیکن فطرت کے ارتقائی عمل میں اس کو سمجھا جاسکتا ہے۔جنسی نوع خوری بہت سے کیڑے مکوڑوں، بچھوؤں، اور گھونگھوؤں وغیرہ میں پائی جاتی

ہے۔یورپ اور شمالی امریکہ کے باغات میں ایک عام پائی جانی والی مکڑی ہے، جو اپنے نر ساتھی کا پہلے سر کھاتی ہے، پھر اس کے ساتھ جنسی ملاپ کرتی ہے۔اپنے جنسی پارٹنر کو کھا جانے سے مادہ کو وہ غذائیت اور توانائی فراہم ہو جاتی ہے، جو اس کے انڈے پیدا کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ہوسکتا ہے، اس کی تخم ریزی ہی اپنے ساتھی کو کھانے سے ہوتی ہو۔

فطرت کے اندر جنسی مطالعہ وتحقیق کرنے پر پتا چلتا ہے، کہ حیاتیاتی دنیا میں نر اور مادہ کے جنسی اعضا کے سائز، رنگ اور اشکال بے پایاں متنوع ہیں۔اور وہ ان کے جسموں پر مختلف جگہ میں ہوتے ہیں۔ایک جانور کا عضو تناسل انگریزی کے Y یعنی دوسر والا بھی ہوتا ہے۔مادہ جس طرف سے چاہے اس سے ملاپ کرلے۔جانداروں میں یہ بھی نہیں، کہ ان کے جنسی اعضا کی شکل وصورت سے ان کو مادہ یا نر قرار دے دیا جائے۔مثلاً وہیل مچھلی مادہ اور نر ظاہری طور پر ایک جیسے ہوتے ہیں۔نر کا عضو تناسل کے اوپر ایک پردہ سا ہوتا ہے۔اور اس کے فوتے بھی اس کے جسم کے اندر ہی ایک چھوٹے سے گھڑے میں ہوتے ہیں۔Hyena کی مادہ میں بھی بالکل اسی طرح کا عضو تناسل ہوتا ہے، جس طرح اس کے نر میں۔ بندروں کی بہت سی قسموں میں مادہ میں Clitoris اتنا ہی لمبا ہوتا ہے، جتنا نر کے عضو تناسل کی لمبائی۔Banana Slug نام ایک جانور اپنے جنسی ساتھی کا عضو تناسل کو چبا کر کھا جاتا ہے اور اس طرح اس کا جنسی فعل تکمیل پاتا ہے۔

بہت سے جانور ایسے ہیں۔جن میں ان کی زندگیوں میں جنسی صنف بدلتی رہتی ہے۔وہ مادہ سے نر اور نر سے مادہ ہو جاتے ہیں۔چنانچہ نر اور مادہ متضاد اور مقابل اصناف نہیں کہی جاسکتیں۔فطرت میں Multigenders کثیر الاصناف جانور پائے جاتے ہیں۔Bluegill Sunfish میں نر تین طرح کے ہوتے ہیں۔چھوٹے، درمیانے اور بڑے۔بڑے انڈوں کی حفاظت کرتے ہیں اور چھوٹے پانی کے پودوں میں چھپے رہتے ہیں جو انڈوں کی تخم ریزی کرتے ہیں۔درمیانے درجے کے نر مادہ مچھلی کو ملاپ کی طرف مائل کرتے ہیں۔اور بڑے نروں کی مدد کرتے ہیں۔دوسری طرح کی Species ایسی ہیں، جن میں ضرورت پڑنے پر صنفی تبدیلی Transformation ہو جاتی ہے۔وہ نر سے مادہ اور مادہ سے بوقت ضرورت نر بن جاتے ہیں۔اس سے ہمیں پتا چلتا ہے، کہ Female اور Male کوئی مستقل نوعیت کی کیفیات کا نام نہیں۔ Bluebanded Gobies ایک طرح کا جاندار ہے، وہ حرم بنا کر رہتا ہے۔ایک نر کی چار سے چھ مادہ بیویاں ہوتی

ہیں۔نر سماجی لحاظ سے غالب حیثیت رکھتا ہے۔اور سب مادہ اس کی ماتحت ہوتی ہیں۔لیکن جب نر نہ رہے،تو سب سے بڑی مادہ اس کی جگہ سنبھال لیتی ہے۔اور اس کے اندر نر کی طرح کی تبدیلیاں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔اور حیرانگی کی بات ہے، کہ اگر وہاں پھر کوئی نر آجائے،تو یہ تبدیل شدہ نر پھر سے مادہ بن جاتا ہے۔

پینگوئن ایسا جانور ہے، جو سب سے زیادہ یک زوج جوڑے میں رہتا ہے۔نر اور مادہ مل کر اپنے انڈوں کو سنبھالنے اور بچوں کو پالنے میں مدد کرتے ہیں،اور کالے سفید ہزاروں پینگوئن میں بھی نر اور مادہ اپنے اپنے ساتھی کو پہچان لیتے ہیں۔ جوڑے ان میں بنتے ہیں، جہاں بچوں کو پالنے کے لیے زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔(انسانوں میں اسی لیے جوڑے بنے)۔

ہم جنس جانوروں میں جنسی فعل سے پہلے پیار و محبت کا کھیل ہوتا ہے۔وہ ایک دوسرے کے اوپر چڑھتے ہیں۔جنسی اعضا کو چھیڑتے،سونگھتے، چاٹتے،جنسی اعضا کی نمائش کرتے ہیں۔ اس کھیل سے بسا اوقات لگتا ہے، کہ یہ لڑ جھگڑ رہے ہیں، یہ عمل عام طور پر باہمی اتفاق سے ہوتا ہے۔اور اسی دوران ایک دوسرے سے جنسی ملاپ کرتا ہے۔شیروں میں بھی ہم جنسیت ملتی ہے۔ کئی بیل ایسے ہیں۔ایک فاعل نر دوسرے مفعول نر کے ساتھ جنسی اختلاط کرنے کے بعد دیکھا گیا ہے، کہ مفعول نر واپسی طور پر اپنی باری نہیں لیتا۔ دیگر ہم جنس پَرست جانوروں میں Orangotans, Rhesus, Macaques, Big Horns Rams, Giraffe, African elephants, Grey whales, Fruit fly, Koalaوغیرہ ہیں۔ ہم جنسیت جانوروں کی جنگلی، نیم جنگلی اور چڑیا گھروں کی قید کے دوران بھی دیکھی گئی ہے۔ مادہ ہاتھیوں کو چڑیا گھروں کی قید میں اپنی سونڈوں سے دوسری مادہ ہاتھی کے جنسی اعضا میں خودلذتی کرتے دیکھا گیا ہے۔ہتھنی کا Clitoris بڑھا ہو کر انچ لمبا ہو جاتا ہے۔

جانوروں میں گروپ سیکس بھی ہوتا ہے۔فطرت کے اندر ایک سے زائد جنسی ساتھی بنانا عام ہے۔گروپ سیکس میں ایک ہی صنف بھی ہوتی ہے، اور مخالف صنف بھی۔اسے Mating Chains بھی کہتے ہیں۔کئی کیڑے اور مینڈک گروپ سیکس میں ملوث دیکھے گے ہیں۔گروپ سیکس سے ایک ہی وقت میں ایک نئی نسل تیار ہو جاتی ہے۔

جو طے شدہ افکار ہوتے ہیں۔ان کو نئی دریافتیں چیلنج کرتی ہیں۔اور طے شدہ افکار کی

طرف سے مزاحمت کی جاتی ہے۔ان کے درمیان جدو جہد جاری رہتی ہے۔خواہ یہ افکار، ثقافتی، اخلاقی اور مذہبی ہوں۔ چارلس ڈارون کو پتا تھا، کہ اس کی تھیوری پر مذہبی پیشواوں کی طرف سے غصہ کا اظہار ہوگا۔لیکن اس نے اپنی کتاب Origin of Species کو چھپوانے کا فیصلہ کیا۔ آج جو لوگ ہم جنس رشتے کے قائل ہو گے ہیں۔ان کو اسٹیٹس کو کی طرف سے مزاحمت درپیش ہے۔جنس اور صنفی تمیز کے پرانے معیار ڈھے رہے ہیں۔حیوانی جنسی رویوں میں تنوع کی تحقیق کا آغاز ارسطو سے شروع ہوا۔جب اس نے ۳۰۰ سال قبل مسیح History of Animals لکھی تھی۔لفظ فطرت میں ہی اختلاف پایا جاتا ہے۔فطرت کسے کہتے ہیں،فطرت ہے کیا۔یہ کہنا فلاں چیز فطری ہے یہ بھی قابل بحث ہے۔اور اس کی پرانی تعریف ڈھے رہی ہے۔جب ہم جانوروں کی جنسی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں،تو فطری دنیا کے بارے میں ہمارے نظریات پر سوالات اٹھنے شروع ہو جاتے ہیں۔سائنسی اوزاروں کے ساتھ تجزیہ و مشاہدہ اور Documentation کا عمل ہم کو بہتر طریقے سے فطرت کے اندر پائے جانے والی جنسی پیچیدگیوں کا تنقیدی تجزیہ کرنے کے قابل بناتا ہے۔

ہم جنس پرستی حیوانی انواعات کے اندر دیکھی گئی ہے۔اصل میں یہ موضوع بھی اخلاقیات اور سیاسی مباحث کا شکار ہو گیا۔اب GLBTQ نام ۔۔ کمیونٹی نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے۔جن میں مردانہ ہم جنس، زنانہ ہم جنس، ہم جنسی اور مخالف جنس کو ایک ساتھ رکھنے والے، وہ جن کی جنس تبدیل ہو جاتی ہے یا کروا لیتے ہیں۔وغیرہ شامل ہیں۔ان کی جدو جہد سے غیر فطری کہلائے جانے والے افعال کے بارے میں پرانے رجعتی تصورات تبدیل ہونے شروع ہو گے ہیں۔ترقی یافتہ دنیا میں جنسی تنوع کو عوامی سطح پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔اور قوانین بدلے جا رہے ہیں۔ کسی انسان کی تذلیل اور اس کو عزت سے محروم اس بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا، کہ اس کا رجحان مختلف جنسی نوع کی طرف ہے۔

کیا اسلام انسانی حقوق کو مانتا ہے؟

اسلام اور مسلمان جدید زمانے، جدید تہذیب کے ساتھ نہیں چل سکتے ان کے لیے ایک الگ زمانہ اور الگ تہذیب درکار ہے۔ اس لئے دیکھا گیا ہے، مسلمان جہاں کہیں رہتے ہیں۔ وہ خود سے یا دوسروں کے ساتھ برسرپیکار ہو جاتے ہیں۔ جدید دنیا سے مطابقت نہیں کر پاتے۔

اسلام اور مسلمان اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی شق 18 کو نہیں مانتے، چنانچہ آج کی جدید انسانی تہذیب کا حصہ بننے میں ان کو مشکلات ہیں۔

18 ویں شق کیا ہے یہ آرٹیکل ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر، آزادی مذہب کا حق دیتا ہے۔ اس حق میں شامل ہے، کہ کوئی بھی اپنا مذہب، عقیدہ تبدیل کر سکتا ہے۔ وہ انفرادی سطح پر ہو، یا کمیونٹی کی شکل میں۔ اپنی ذات تک ہو، یا کھلے عام ہو اور اسے اپنے مذہب، عقیدے پر عمل کرنے، عبادت کرنے اور اس کا کھلا اظہار کرنے کا حق ہے۔ اسلام میں مذہب بدلنے والے کی سزا موت ہے۔ اور دوسرے مذہب اور عقیدے رکھنے والوں پر قدغن لگائی جاتی ہیں۔ اور بسا اوقات ان کی زندگی ہی اجیرن کر دی جاتی ہے۔ اسلام میں غیر مسلموں سے جزیہ یعنی اضافی ٹیکس لینے کا تصور بھی موجود ہے۔ دوسرے مذہب والوں کو سیکنڈ کلاس شہری سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے بعد بھی ان کی ایک شہری کی حیثیت سے زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے۔ وہ ملازمت میں نہیں رہ سکتے، وہ کاروبار نہیں کر سکتے۔ ہر طرح کے بائیکاٹ کی تحریک چلا دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ نوبل انعام یافتہ سائنس دان عبدالسلام کو اس لئے عزت اور مقام نہ دیا گیا یا ان سے استفادہ نہ اٹھایا جا سکا، کہ ان کا خاندانی تعلق احمدی کمیونٹی سے تھا۔

Article 18.

Everyone has the right to freedom of thought, conscience

and religion this right includes freedom to change his religion or belief, and freedom, either alone or in community with others and in public or private, to manifest his religion or belief in teaching, practice, worship and observance.

اسلام اور مسلمان انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کی پہلی شق کو بھی نہیں مانتے یہ نہیں سمجھتے تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں، بقول ان کے تمام انسان مسلمان پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہونے کے بعد وہ مسلمانوں اور کافروں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں اور کافروں کے درمیان حقوق اور وقار کا ایک جیسا معیار منع ہے۔ مسلمانوں کے تحت اگر کافر رہتے ہیں، تو ان کو دوسرے درجے کے شہری کے طور پر رہنا ہوگا اور مسلمانوں سے اپنے تحفظ کا ٹیکس ادا کرنا ہوگا اور جو کافر مسلمانوں کے ماتحت نہیں رہتے۔ ایک دن ان کا خاتمہ کرنا اور غلبہ اسلام کا آنا لازم ہے۔

آرٹیکل 1

تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں، اور وہ اپنے حقوق اور وقار میں یکساں ہیں۔ ان میں عقل اور شعور کا فطری جوہر موجود ہے۔ اور ان کو اخوت عالم کے جذبے کے تحت کام کرنا چاہیے۔

Article 1.

All human beings are born free and equal in dignity and rights. They are endowed with reason and conscience and should act towards one another in a spirit of brotherhood.

اسلام اور بہت سے مسلم علمائے دین بنیادی انسانی حقوق کے شق 4 کو بھی نہیں مانتے۔ اسلام میں غلامی کو کبھی حرام قرار نہیں دیا گیا، تمام اسلامی تاریخ میں غلام اور لونڈیاں موجود رہی ہیں، ان کی تجارت خرید و فروخت ہوتی رہی ہے اسلام میں باقاعدہ وسیع پیمانے پر غلاموں اور لونڈیوں کے معاملات کے بارے شرعی قوانین موجود ہیں۔ مسلم دنیا میں اس وقت غلامی کا رسمی طور پر خاتمہ ہوا، جب سیکولر انسانی تہذیب نے اسے ممنوع قرار دیا۔ آج بھی ان علمائے دین کی کوئی کمی نہیں، جو یہ سمجھتے ہیں، کہ کفر و اسلام کی کسی جنگ اور معرکے میں پھر غلام اور لونڈیاں رکھنے کی اجازت ہوگی۔ خلافت کی داعی داعش تنظیم نے جنگ میں اٹھائی گئی غلام عورتوں کے نظام کو بحال

کیا، جن کے ساتھ جنسی تعلق اور خرید و فروخت کی اجازت دی گئی۔

آرٹیکل 4

کوئی کسی کو غلام نہیں بنا سکتا، نہ اسے غلامی میں رکھ سکتا ہے۔ غلاموں کی تجارت خواہ وہ کسی شکل میں ہو، ممنوع ہے۔

Article 4

No one shall be held in slavery or servitude;slavery and the slave trade shall be prohibited in all their forms.

- اسلام اور مسلمان انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کی شق 5 کو بھی نہیں مانتے۔ اسلام میں اعضا کے کاٹنے، کوڑے مارنے، ہجوم کے ہاتھوں پتھر برسا کر ملزم کو مارنے کی شرعی سزا موجود ہے اور جہاں کہیں آج بھی شدت پسند اسلامسٹ اختیار رکھتے ہیں، یہ سزائیں نافذ کرتے ہیں، حتیٰ کہ انسانی سروں کو کاٹ کر درختوں اور کھمبوں کے ساتھ لٹکایا جاتا ہے۔ اور ان سے فٹ بال بھی کھیلا جاتا ہے۔

آرٹیکل 5

کسی کے ساتھ بھی اذیت ناک، غیر انسانی، تذلیل کرنے والا سلوک یا سزا نہیں دی جا سکتی۔

Article 5.

No one shall be subjected to torture or to cruel, inhuman or degrading treatment or punishment.

اسلام میں انسانی حقوق کے چارٹر کی شق 12 کی بھی گنجائش موجود نہیں ہے۔ اسلام میں برائیوں سے روکنے، اور نیکی کی طرف راغب کرنے کا اصول اس شق کی سپرٹ سے متصادم ہے اسلام کا مذکورہ اصول ہر شخص کو اجازت دے دیتا ہے، کہ وہ کسی دوسرے شخص کی پرائیویسی میں مداخلت کر سکتا ہے اسلامی معاشرے میں اس طرح کی نیم سرکاری رضا کار فورس بنائی جاتی ہے، جو لوگوں کی نجی زندگی میں زبردستی مداخلت کرتی ہے، حتیٰ کہ لباس اور وضع قطع کیسی ہو، آپ نے کیا سننا ہے، کیا دیکھنا ہے، کیسے بیٹھے اور لیٹے ہوئے ہیں۔ ان میں بھی اسلام کے نام پر مداخلت کی جا سکتی ہے۔ میں گھر میں باتھ روم بنوا رہا تھا، تو کاریگر نے مجھے ٹوکا کہ کموڈ کا رخ اسلام کے مطابق یوں رکھنا ہے، میں

گاڑی میں بیٹھا معمولی آواز میں میوزک سن رہا تھا، کہ ایک شخص نے مجھے آ کر روکا، کہ اذان ہو رہی ہے، میوزک بند کرو۔ ایک ہوٹل کے کمرے میں ایسے پاؤں پسارے لیٹا، تو ہوٹل ملازم نے کہا، اس طرف ٹانگیں نہیں کر کے لیٹ سکتے۔ میرے تامل کرنے پر کہا، 'کاٹنے کا حکم ہے'۔۔۔ اسلام کسی بھی وقت ایسی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اسلامی معاشروں میں عورت اور مرد باہم اکٹھے نہیں ہو سکتے، اسلامی جمعیت طلبا یونیورسٹیوں میں طلبا و طالبات کو کسی جگہ اکٹھے ہونے پر ہنگامہ کرتے ہیں۔ نکاح نامے مانگے جاتے ہیں۔ رشتے پوچھے جاتے ہیں۔ گویا اسلام میں ہر شخص دوسرے کی پرسنل زندگی میں مداخلت کر سکتا ہے۔ چنانچہ اسلام میں آرٹیکل 12 کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آرٹیکل 12

کسی انسان کی پرائیویسی، خاندان، گھر، میں یک طرفہ مداخلت کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، نہ کسی کی عزت اور شہرت پر حملہ کرنے کی، کسی ایسی مداخلت، یا حملہ پر ہر ایک کو قانون کا تحفظ حاصل ہوگا۔

Article 12.

No one shall be subjected to arbitrary interference with his privacy, family, home or correspondence, nor to attacks upon his honour and reputation. Everyone has the right to the protection of the law against such interference or attacks.

مندرجہ بالا حقائق سے ثابت ہوتا ہے، کہ اسلام جدید تہذیب اور جدید زمانے کے مرتب کردہ انسانی بنیادی حقوق سے متصادم ہے۔ مغربی دنیا اصولی اور نظریاتی طور پر ان انسانی حقوق سے متفق ہیں، ہو سکتا، کہیں نہ کہیں وہ مسلمانوں کے خیال کے مطابق ان پر کما حقہ عمل پیرا نہ ہوں لیکن علمی اور فکری سوال یہ ہے، کہ اسلام اصولی اور بنیادی طور پر ہی ان انسانی بنیادی حقوق کو نہیں مانتا انسانی حقوق سیکولر صنعتی معاشرے کی پیداوار ہے۔ ان کا کسی دینی معاشرے سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلامسٹ اتفاق کرتے ہیں۔ انسان کے کیا بنیادی حقوق ہو سکتے ہیں، اسلام خود ان کو متعین کرتا ہے اور وہ ان انسانی حقوق سے مختلف اور متضاد ہیں۔ جسے عالمی برادری طے کر چکی ہے۔ ماڈریٹ مسلمان اسلام کے بارے میں تہذیب جدید سے باتیں لے کر اسلام کو اپ ڈیٹ

کرتے ہیں۔ اسلامسٹوں کا رویہ رہا ہے، کچھ چیزیں ایسی ہیں، جو بے اسلامی، لیکن کھلے عام کہی جائیں۔ تو ناگوار محسوس کرتے ہیں، بلکہ کہتے ہیں، اسلام پر تنقید ہو رہی ہے، یا اسلام پر (خدا نخواستہ) حملہ ہو رہا ہے۔ لیکن وہ ناگزیر طور پر اسلام کا حصہ ہوتے ہیں اور اسے سب اہل ایمان، علمائے حضرات برحق مان بھی رہے ہوتے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے، کہ جتنے مسلمان ہیں، اسلام کی اتنی ہی تعبیریں اور اتنی ہی تشریحات ہیں۔ لیکن جب اسلام عملی لحاظ سے مروج اور نافذ ہوتا ہے، وہ مولوی کا اسلام ہی ہوتا ہے۔ اب اسلام جدید دور، جدید تہذیب، سائنس اور علم سے کئی جگہ پر متصادم ہو چکا ہے تو پھر کیا کیا جائے۔ یہ اہم سوال ہے مسلمانوں نے اسی دنیا میں، اسی دور میں اور اسی جدید تہذیب میں زندہ رہنا ہے۔ تو پھر ایک ہی صورت ہے، کہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی طرح مسلمان بھی اپنے دین اسلام کو اپنی ذات تک محدود کرلیں۔ اسے سیاسی، سماجی، ریاستی، قانونی، آئینی دائرے میں لانے کی ضد چھوڑ دیں۔ تاکہ اسلام متنازعہ اور جدید دور کے ساتھ ٹکرانے سے بچ جائے۔ اسے عرف عام میں سیکولرازم کہا جاتا ہے اس سے تمام اسلامی دنیا کو خارجی اور داخلی امن نصیب ہو جائے گا۔ مسلمان دیگر اقوام اور دیگر مذاہب کے ساتھ مل کر ترقی کی طرف قدم بڑھا سکیں گے۔ ورنہ مسلمان خود اپنے ساتھ لڑتے اور دیگر اقوام اور مذاہب کے ساتھ متصادم رہیں گے، ان کو امن، چین اور سکوں نصیب ہونے والا نہیں ہے۔

جس کا اسلامی مطالعہ نہایت محدود اور خیالی قسم کا ہے۔ وہ سمجھتا ہے، کہ اسلام غیر مسلموں اور کفار کے ساتھ ایک بہترین انسانی سلوک کا داعی ہے۔ لیکن جن کا گہرا اسلامی مطالعہ ہے، انہیں کچھ یوں معلومات ملتی ہیں:

اسلام کو نہ ماننے والے کافروں کا مقام:

یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ غافل ہیں۔

(الاعراف:179)

مشہور مفسر و امام ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا: اور جس نے کفر کیا وہ جانور بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔

(تفسیر ابن کثیر مترجم، جلد 2 صفحہ 438، مکتبہ اسلامیہ لاہور)

کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ ان کی اکثریت کچھ سنتی اور سمجھتی ہے، ہرگز نہیں یہ سب جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ ہی گم کردہ راہ ہیں۔

(الفرقان:44)

اور اللہ کے ہاں سب جانداروں میں سے بدتر وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا پھر وہ ایمان نہیں لاتے۔

(الانفال:55)

اے ایمان والو! بے شک مشرک بالکل ہی نجس (ناپاک) ہیں۔

(التوبہ:28)

بعض علماء کا خیال ہے، مشرکوں کے بدن بھی ناپاک ہیں۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جو ان سے مصافحہ کرے وہ ہاتھ دھو ڈالے۔

(تفسیر ابن کثیر مترجم، ج2 ص 549-550، مکتبہ اسلامیہ لاہور)

پس کافروں پر اللہ کی لعنت۔

(البقرۃ:89)

جو لوگ کافر ہوئے اور کافر ہی مرے ایسوں پر خدا کی اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت۔

(البقرۃ:161)

ان لوگوں سے لڑو، جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے جو اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ شے کو حرام نہیں جانتے، نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان لوگوں میں جنہیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ذلیل وخوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔

(التوبہ:29)

مفسر ابن کثیر نے اس آیت کی شرح میں لکھا:

پس (اللہ) فرماتا ہے کہ جب تک وہ ذلت و خواری کے ساتھ اپنے ہاتھوں جزیہ نہ دیں انہیں نہ چھوڑو۔

چنانچہ خالد بن ولید نے اہل فارس کے نام خط لکھا، جس میں موجود تھا کہ ہم تمھیں اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں، اگر تم انکار کرو تو تم اپنے ہاتھوں جزیہ ادا کرو اس حال میں کہ تم ذلیل ہو کیونکہ میرے ساتھ ایسے لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں قتال کو ایسے پسند کرتے ہیں جیسے فارسی شراب پسند کرتے ہیں۔ (حاکم: 299/3، طبرانی کبیر: 105/4، مسند علی بن الجعد: حدیث 2304، مجمع الزوائد: 5/310،)

چنانچہ ابوالحویرث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے عیسائیوں پر ہر سال تین سو دینار کی ادائیگی لازم قرار دی تھی اور یہ لازم قرار دیا تھا کہ جو مسلمان ان کے پاس سے گزرے وہ اس کی تین دن تک مہمان نوازی کریں گے اور وہ کسی مسلمان کو دھوکہ نہیں دیں گے۔

(مسند امام شافعی، جزء چہارم، کتاب الاسرو الفداء، باب ضرب الجزیۃ، حدیث 1771، مصنف عبدالرزاق: حدیث 10092، السنن الکبریٰ للبیہقی: 9/19)

مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ نے اس پر مزید یہ بھی اضافہ کر دیا کہ اگر مسلمان ان کے پاس سے گزریں تو یہ کافر تین دن تک ان کی نہ صرف مہمان نوازی کریں گے بلکہ ان کی دیگر ضروریات زندگی بھی مہیا کرنے کے پابند ہوں گے۔

عمر بن خطابؓ نے سونے (میں ادائیگی کرنے) والوں پر چار دینار اور چاندی (میں ادائیگی کرنے) والوں پر چالیس درہم جزیہ مقرر فرمایا، اس کے ساتھ ساتھ (گزرنے والے) مسلمانوں کی ضروریات زندگی اور تین دن کی مہمان نوازی۔ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجہاد، باب الجزیۃ، حدیث 4041، سنن ترمذی، حدیث 1589)

عقبہ بن عامرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

اللہ کے رسول ﷺ! ہم کسی قوم کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ ہماری مہمان نوازی کرتے ہیں نہ ہمارا وہ حق ادا کرتے ہیں جو ان پر عائد ہوتا

ہے اور ہم بھی ان سے اپنا حق (زبردستی) حاصل نہیں کرتے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اگر وہ انکار کریں اور تمہیں زبردستی لینا پڑے تو (زبردستی کر کے) لو۔ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجہاد، باب الجزیۃ، حدیث 4041، موطا امام مالک: 1/279، حدیث 623)

شریعت ایک غیر مسلم کافر کو یہ حق اور مقام دیتی ہے، اگر کوئی مسلمان اس کو قتل کر دے تو اسلامی ریاست جو اپنے ہاں قتل کے بدلے قتل پر یقین رکھتی ہے، مگر کافر کے بدلے میں قاتل مسلمان کو سزائے موت نہیں دی جائے گی۔ (سنن ابوداود، کتاب الدیات، باب ایقاد المسلم من الکافر، حدیث 4530)

کچھ اسی طرح کا امتیازی سلوک اور نفرت پر اکسانے والا مواد پڑھ کر طالبان اور داعش جیسی تنظیمیں وجود میں آ جاتی ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ روایات بھی ہیں، جب غیر مسلمانوں کے ساتھ قدرے بہتر رویہ بھی اپنایا گیا۔ لیکن وہاں ہمیں وہ خلیفہ اور بادشاہ ملتے ہیں۔ جو خود اعتدال پسند تھے اور بنیاد پرستی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

لیکن عام مسلمان نے جو خود سے ہی خیالی مثالی تصویر بنا رکھی ہے، اسے اسلام کے اس پہلو کا بھی پتا ہونا چاہئے۔ تا کہ ہم نے موجودہ دور میں کس طرح بہتر طریقے سے زندہ رہنا ہے اور ترقی یافتہ تہذیب جدید نے جو انسانی اور اخلاقی معیار قائم رکھے ہیں۔ ان کے ساتھ کیسے چلنا ہے۔ جب تک مسلمان کسی یک طرفہ اسلام کا خیالی نقشہ بنائے رکھیں گے، یہ بھٹکتے رہیں گے۔

چنانچہ خالد بن ولید نے اہل فارس کے نام خط لکھا، جس میں موجود تھا کہ ہم تمھیں اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں، اگر تم انکار کرو تو تم اپنے ہاتھوں جزیہ ادا کرو اس حال میں کہ تم ذلیل ہو کیونکہ میرے ساتھ ایسے لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں قتال کو ایسے پسند کرتے ہیں جیسے فارسی شراب پسند کرتے ہیں۔ (حاکم: 3/299، طبرانی کبیر: 4/105، مسند علی بن الجعد: حدیث 2304، مجمع الزوائد: 5/310۔)

چنانچہ ابوالحویرث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے عیسائیوں پر ہر سال تین سو دینار کی ادائیگی لازم قرار دی تھی اور یہ لازم قرار دیا تھا کہ جو مسلمان ان کے پاس سے گزرے وہ اس کی تین دن تک مہمان نوازی کریں گے اور وہ کسی مسلمان کو دھوکہ نہیں دیں گے۔

(مسند امام شافعی، جزء چہارم، کتاب الاسرو الفداء، باب ضرب الجزیۃ، حدیث 1771، مصنف عبدالرزاق: حدیث 10092، السنن الکبریٰ للبیہقی: 9/19)

مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ نے اس پر مزید یہ بھی اضافہ کر دیا کہ اگر مسلمان ان کے پاس سے گزریں تو یہ کافر تین دن تک ان کی نہ صرف مہمان نوازی کریں گے بلکہ ان کی دیگر ضروریات زندگی بھی مہیا کرنے کے پابند ہوں گے۔

عمر بن خطابؓ نے سونے (میں ادائیگی کرنے) والوں پر چار دینار اور چاندی (میں ادائیگی کرنے) والوں پر چالیس درہم جزیہ مقرر فرمایا، اس کے ساتھ ساتھ (گزرنے والے) مسلمانوں کی ضروریات زندگی اور تین دن کی مہمان نوازی۔ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجہاد، باب الجزیۃ، حدیث 4041، سنن ترمذی، حدیث 1589)

عقبہ بن عامرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

اللہ کے رسول ﷺ! ہم کسی قوم کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ ہماری مہمان نوازی کرتے ہیں نہ ہمارا وہ حق ادا کرتے ہیں جو ان پر عائد ہوتا

ہے اور ہم بھی ان سے اپنا حق (زبردستی) حاصل نہیں کرتے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اگر وہ انکار کریں اور تمھیں زبردستی لینا پڑے تو (زبردستی کر کے) لو۔ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجہاد، باب الجزیۃ، حدیث 4041، موطا امام مالک: 1/279، حدیث 623)

شریعت ایک غیر مسلم کافر کو یہ حق اور مقام دیتی ہے، اگر کوئی مسلمان اس کو قتل کر دے تو اسلامی ریاست جو اپنے ہاں قتل کے بدلے قتل پر یقین رکھتی ہے، مگر کافر کے بدلے میں قاتل مسلمان کو سزائے موت نہیں دی جائے گی۔ (سنن ابوداود، کتاب الدیات، باب ایقاد المسلم من الکافر، حدیث 4530)

کچھ اسی طرح کا امتیازی سلوک اور نفرت پر اکسانے والا مواد پڑھ کر طالبان اور داعش جیسی تنظیمیں وجود میں آ جاتی ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ روایات بھی ہیں، جب غیر مسلمانوں کے ساتھ قدرے بہتر رویہ بھی اپنایا گیا۔ لیکن وہاں ہمیں وہ خلیفہ اور بادشاہ ملتے ہیں۔ جو خود اعتدال پسند تھے اور بنیاد پرستی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

لیکن عام مسلمان نے جو خود سے ہی خیالی مثالی تصویر بنا رکھی ہے، اسے اسلام کے اس پہلو کا بھی پتا ہونا چاہیے۔ تاکہ ہم نے موجودہ دور میں کس طرح بہتر طریقے سے زندہ رہنا ہے اور ترقی یافتہ تہذیب جدید نے جو انسانی اور اخلاقی معیار قائم رکھے ہیں۔ ان کے ساتھ کیسے چلنا ہے۔

جب تک مسلمان کسی یک طرفہ اسلام کا خیالی نقشہ بنائے رکھیں گے، یہ بھٹکتے رہیں گے۔

مغربی تہذیب کے خلاف پروپیگنڈا

''جنسی بے راہ روی''

ہم مشرقی تہذیب والوں کا سب سے پسندیدہ موضوع مغرب کی ''جنسی بے راہ روی'' ہے۔ ہم مسلمانوں کے لئے مختلف ماحول کو معروضیت سے سمجھنا مشکل ہے۔ اپنے سے مختلف چیزوں کو فورا برا اور غلط قرار دیتے ہیں۔ رہن سہن، معاشرتی نظام اور اخلاقی معیارات جامد ہوتے ہیں نہ مقدس۔ یہ سماجی تبدیلیوں اور بقا کی ضرورتوں کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ مغرب میں جب ہر شخص معاشی طور پر خود مختار ہو گیا۔ اور سائنس نے حیات و کائنات کی نئی تفہیم پیدا کر دی، تو نئی اخلاقیات نے جنم لیا جس سے تمام افراد باہمی دباو اور سوسائٹی کے جبر سے آزاد ہو گے۔ مغرب نے یہ راز پالیا۔ کہ سب سے مقدم چیز خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی خوشی ہے۔ جب کہ مشرقی معاشرہ اور مذہبی سوچ فرد کے پاس نہ دماغ رہنے دیتی ہے۔ نہ اپنی جبلتوں پر اس کا کوئی اختیار۔ انسان کی اپنی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔ مغرب کے انسان نے دیکھا، اس زندگی میں جو کچھ بھی پیش آتا ہے۔ اسے خود ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ ہم اس دنیا اور اس کے ماحول کو اپنی کوشش اور عقل سے بہتر کر سکتے ہیں۔ انسان کو اپنی دنیا خود ہی بنانی ہے۔ لہٰذا اپنی ذہنی، جسمانی اور روحانی لطافتوں کی حسوں کو سامان تسکین بہم پہنچانے کا اس کو پورا حق ہے۔ فطری خوشیوں اور مسرتوں پر اگر سماجی قواعد کے سخت پہرے لگا دیئے جائیں۔ تو نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ ذہنیت ہی ننگی ہو جاتی ہے۔ مغرب والوں کو احساس بھی نہیں ہوتا، کس کا کون سا جسمانی حصہ دکھائی دے رہا ہے۔ جب کہ ہم پاک بازوں کو اس کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا، کہ شرم و حیا کے پیکروں سے جنسی احساس ختم ہو جاتا لیکن ہوا الٹ۔ ان متقی معاشروں میں انسان کو انسان نہیں، ان کو جنسی اعضا کے طور پر دیکھا

جاتا ہے۔ عورت ذات کا مطلب ہی فحاشی ہے۔ اس کو پردوں، برقعوں، چار دیواری میں ڈال دو۔ تا کہ مومن مرد کے اخلاق پر برے اثرات نہ پڑ جائیں۔ مرد اور عورت کو آپس میں ملنے اور قریب آنے سے بچانا ہے۔ حیرت ہے، برہنہ اجسام اور جنسی اعضا کے ساتھ سب سے زیادہ دلچسپی انہی شرم و حیا کے پتلوں کو ہوتی ہے۔ اصل میں ننگا پن دیکھنے والے کی اپنی نظر اور ذہن میں ہوتا ہے۔ مغرب میں عورت کی عزت جتنی محفوظ ہے، اتنی کسی پاک باز معاشرے میں نہیں۔ جوان لڑکی ملکوں ملکوں اکیلی سفر پر نکلتی ہے۔ ہوٹلوں میں اجنبی مردوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں بسا اوقات رات بسر کرتی ہے۔ لیکن کیا مجال کوئی کسی کے ساتھ زبردستی کر جائے۔ یہ نہیں کہ وہاں ریپ نہیں ہوتے۔ لیکن آزادی کی نسبت بہت ہی کم۔ یہاں مشرقی تہذیب میں پاکباز معاشرے میں کسی عورت کی عزت محفوظ نہیں ہوتی۔ مغرب میں تمام تر آزادی کے باوجود اگر عورت 90 فی صد محفوظ ہے، تو ادھر مشرق میں 90 فی صد غیر محفوظ۔ شرافت، حیا، اور پردے کے خول نے ہمیں جنسی مریض بنا رکھا ہے۔ مغرب کے لوگ زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم مشرقی تہذیب میں زندگی بھگت رہے ہیں۔ ہم وہ لوگ ہیں، جو انسان ہونے پر شرمندہ ہیں۔ اپنے جسم کو گناہ اور بدن کو پلید سمجھتے ہیں۔ اس کی طبعی خواہشوں کو کچلتے اور دباتے ہیں۔ یعنی حقیقی ''جنسی بے راہ روی'' نام نہاد حیا دار مشرقی معاشرے میں ہے۔

کوئی تہذیب ترقی یافتہ ہوتی ہے، یا پسماندہ۔ اسے اچھے برے کے پیمانے سے نہیں ناپا جانا چاہئے۔ یہ نہیں ہوتا، آپ پس ماندہ ہوں، لیکن آپ کی تہذیب بہت عمدہ ہو۔ مشرقی تہذیب پر پرانے فیوڈل اور قبائلی اقدار کی چھاپ ہے۔ جب کہ مغربی تہذیب جدید ترقی یافتہ سائنسی معاشرے کی پیداوار ہے۔ ہم سمجھتے ہیں، مغربی تہذیب انسانی اور اخلاقی قدروں سے بالکل عاری ہے۔ ہمیں مغرب کی ٹیکنالوجی پسند ہے، لیکن تہذیب ہم پرانی ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ پرانی تہذیب بے وقت کی راگنی ہوتی ہے۔ ہم اسے غیر فطری طریقے سے گھسیٹ رہے ہوتے ہیں۔ فطری تہذیب وہ ہے، جو وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ جس میں انسان پھلتا پھولتا ہو، آرام دہ محسوس کرے۔ مادی اور روحانی مسرتوں سے ہم کنار ہوتا ہو۔ پس ماندہ تہذیب زندگی کو گھٹن کا شکار بناتی ہے۔ مغربی تہذیب میں بالغ مرد و زن کا خود کفیل ہونا، اور چھوٹے خاندان کا تصور عمومی خوشحالی پیدا کرتا ہے۔ جب کہ ہماری تہذیب میں آدھی آبادی کو گھر میں بٹھانے کی کوشش کی جاتی

ہے اور بچوں پر بچے پیدا کئے جاتے ہیں۔ ہماری مشرقی قدریں اور رسم ورواج اجتماعی اور انفرادی زندگی کو اجیرن بنانے کے سوا کوئی کردار ادا نہیں کرتی۔ مغربی تہذیب خوامخواہ کے بندھنوں سے فرد کو آزاد کرتی ہے۔ تاکہ انسان خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھ سکے۔ ہر فرد اپنے آپ کا ذمہ دار ہوتا ہے، کسی پر بوجھ نہیں ہے مشرقی تہذیب میں اجتماعی اور خاندانی نظام اس طرح بنا ہوتا ہے، کہ اس میں فرد کو خود کفیل نہیں بننے دیا جاتا۔ نہ کوئی خود کفیل بنے نہ ایک دوسرے سے آزاد ہوں۔ اس کی وجہ سے ہماری دو تہائی آبادی بے کار رہتی ہے۔ ہر کوئی اپنے عزیز واقارب کا جذباتی رشتوں کے حوالے سے استحصال کرتا ہے۔ ماں باپ اولاد کا، بچے والدین کا، بہنیں بھائیوں کا، بھائی بہنوں کا، بھائی بھائی کا، دوست دوست کا۔ ہر کوئی دوسرے کو جذباتی بلیک میل کر کے فائدہ اٹھا رہا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے مشرقی معاشرے میں لوگوں کو مفت خوری اور آسان راستوں سے زندگی گزارنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ کام چوری، کاہلی، مفت خوری، اور دوسرے پر مفت بھری کا رعب، نمائش ہمارے معاشرے کی خاص خصوصیات ہیں۔ جب کہ مغرب میں دوسروں پر انحصار کرنا غیر اخلاقی حرکت سمجھی جاتی ہے۔ اور ہر کوئی اپنی زندگی اپنے طور پر گزارتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں کل کی فکر اور دنیا کیا کہے گی، ہماری زندگیوں کو اس قدر تباہ کرتی ہے۔ خود ہمارا وجود اور زندگی دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں۔

مشرقی تہذیب حیات کش ہے۔ دنیا کیا کہے گی انسان کے عمل وفکر پر قدغنیں لگا کر فطری صلاحیتوں کو کچل دیتی ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے مخفی وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کی اسے ضرورت اور خواہش ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں بندہ اور منافق معاشرہ جنم لیتا ہے۔ مغربی تہذیب دنیا کیا کہے گی کے عذاب سے آزاد ہے۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، دوسرا کیا کر رہا ہے۔ ہر فرد دوسرے فرد کی خود مختار حیثیت کو تسلیم کرتا ہے۔ جب تک کسی کا فعل دوسرے کے لیے باعث ضرر نہ ہو۔ مشرقی باشندہ پورے معاشرے کی نظروں کا قیدی ہوتا ہے۔ ہر کوئی دوسرے کا ٹھیکیدار۔ خواہ خود کچھ بھی ہو۔ کوئی کس طرح اٹھتا ہے، بیٹھتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، کہاں جاتا ہے، کہاں سے آتا ہے، کس سے ملتا ہے۔ ان سب باتوں کا خیال رکھنا اردگرد کے لوگوں کا اولین فرض ہے۔ کیا ایسی تہذیب میں پلے لوگ نارمل قرار دیئے جا سکتے ہیں؟ مشرقی باشندے کو قدرت جتنے آج فراہم کرتی ہے۔ وہ انہیں کل کے خوف میں تج دیتے ہیں اور بالآخر

ساری زندگی گنوا کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ آنے والے وقت کی فکر اور خوف اس قدر ہوتا ہے۔ پوتے پوتیوں کی فکر میں نہ خود آرام سے بیٹھتے ہیں۔ نہ اردگرد کے لوگوں کو چین سے بیٹھنے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اہل مغرب ایک ایک لحہ کو قیمتی سمجھتے ہیں۔ زندگی کا مزہ لیتے ہیں۔ خوب محنت کرتے ہیں۔ اور اپنی کمائی کو خود پر خرچ کرتے ہیں۔ اپنی کمائی دولت کو اپنے اوپر خرچ کرنا انسان کا بنیادی استحقاق ہے۔

کمزور خاندانی نظام۔

نوعمری میں بچے ماں باپ کی شفقت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

بوڑھے ماں باپ کو تنہا زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ عمر رسیدہ لوگوں کو ''بوڑھے لوگوں کے ہاسٹل'' میں بھیج دیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے، کہ مغربی والدین اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت جس محبت اور لگن سے کرتے ہیں۔ ہم اس معیار کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہمارے اور ان کے درمیان بنیادی فرق والدین کی فطری محبت کے کم یا زیادہ ہونے میں نہیں۔ بلکہ بچوں کو اپنی ''ملکیت'' سمجھنے اور نہ سمجھنے میں ہے۔

ہمارے ہاں کے والدین میں محبت کم اور ملکیتی جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ جب کہ بچوں کے ساتھ حقیقی محبت کا اظہار صرف مغرب کے والدین کرتے ہیں۔ وہ ہماری طرح بچوں پر ''سرمایہ کاری'' نہیں کرتے تاکہ کل ان سے فائدہ اور نفع حاصل کیا جا سکے۔ مغربی والدین بچوں کی بہترین تربیت کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں ان کی انفرادیت اور آزادی کی قربانی نہیں مانگتے۔ بالغ ہونے پر ہر ایک فرد اور شخصیت ہوتا ہے۔ اس کی اپنی انا، اپنا وجود، اپنا ذہن اور دماغ ہے۔ وہ اچھے برے کی تمیز کر سکتا ہے۔ وہ اپنی ذات، زندگی اور مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ نسلوں نے آگے کو چلنا ہوتا ہے۔ پیچھے کو نہیں۔ نئی نسل کو خود مختار فرد کے طور پر تسلیم کر لینا سماج اور صحت مند نسلوں کے لئے بہترین ہے۔ چنانچہ ہر نسل اپنی کفالت خود کرنے لگ جاتی ہے۔ کوئی کسی پر بوجھ بن کر ایک دوسرے کے معیار زندگی کو کم نہیں کرتا۔ ہر فرد جواں سالی میں ہی ذمہ دار شہری کا کردار سنبھال لیتا ہے۔ نوجوان جب اپنے فیصلے آپ کرتے ہیں، ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ ان کی صلاحیتیں بڑھتی ہیں، معاشرہ مجموعی طور مزید خوشحال ہوتا ہے۔ بچے جوان ہونے

پر دو طرفہ خوشی اور رضامندی سے الگ ہوتے ہیں۔ مغرب میں نوجوانوں میں جو ''بربادی'' ہمیں نظر آتی ہے، اس کا وہاں کوئی وجود نہیں۔ اگر ایسا ہوتا، تو دنیا کی بہترین دماغی اور پیداواری صلاحتیں ان کے پاس نہ ہوتیں۔ انہوں نے معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کے رستے کھول دیئے۔ امیر ترین خاندان کی اولاد بھی آغاز بلوغت میں کام کر کے کمانا سیکھتی ہے۔ تاکہ کسی کو حرام اور مفت کمائی پر پلنے کی عادت نہ پڑے۔ اسی وجہ سے ان کی چھوٹی سی آبادی والے ملک کی قومی پیداوار ہمارے کروڑوں کی آبادیوں والے کئی ملکوں سے زیادہ ہوتی ہے۔

مشرقی تہذیب کا ''مشترکہ خاندانی'' نظام مفت خوری اور حرام خوری کی عادت ڈال کر نسلوں کو معذور کر دیتا ہے۔ ایک کما رہا ہے، دس کھا رہے ہیں۔ باپ نہیں تو بڑا بیٹا کولہو کا بیل۔ بعض گھرانوں میں کوئی ایک بیٹی پورے خاندان کو پال رہی ہوتی ہے۔ زیادہ تر عورتیں ویسے ہی عضو معطل ہیں۔ شوپیس اور گھریلو خدمت گار۔ جہیز کا احسان کر کے وراثت سے بھائی ان کو بے دخل کر دیتے ہیں۔ عورت کو طلاق ہو جائے، اس کا کوئی پرسان حال نہیں، ہر رشتے دار دوسرے کو جذباتی بلیک میل کرتا ہے۔ مغرب میں نہ اولاد ماں باپ پر بوجھ، نہ ماں باپ اولاد پر۔ ہمارے ہاں ماں باپ امیر ہوں۔ تو ان کی خدمت کا بھرم رکھا جاتا ہے۔ مفاد کی خاطر ان کی ہر جائز ناجائز مانی جاتی ہے۔ مڈل کلاس کے والدین اپنی جوان اولاد پر زبردستی کے فیصلے ٹھونس کر ان کی خوشی اور ترقی کے راستوں کو پامال کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں سب زبردستی کے رشتے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی کسی کا خیال بھی رکھتا ہے، تو اس لئے کہ ''دنیا کیا کہے گی''، یا پھر قربانی کا بکرا بن کر اپنی خوشیوں کا گلہ گھونٹوں۔ مغرب نے سیکھ لیا، بات خاندان کی خوشی کی نہیں فرد کی خوشی کی بات ہونی چاہئے۔

مغرب میں بوڑھے قابل رحم نہیں اپنی مرضی اور خوشی کی زندگی گزارتے ہیں۔ ہمارے منافقانہ مشرقی معاشرے میں ہر دوسرے گھر میں بوڑھے والدین ذلت اور تنہائی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ بڑھاپا اس سے زیادہ مزیدار نہیں ہو سکتا، کہ آپ کسی کے محتاج نہ ہوں اور بڑھاپے میں بھی اپنی مرضی و منشا سے رہ سکیں۔ مغرب کے بوڑھے آخری دم تک پوری زندگی گزارتے ہیں۔ اپنی تفریحی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آنے دیتے۔ اس لئے انہیں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔ ہمارے بوڑھے عضو معطل بن کر محتاجی اور بے مصرفی کی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنے

عزیزوں کے سہارے اور قربت کے خواہاں رہتے ہیں۔ اور جب اولاد اپنی مصروفیت کی وجہ سے ان کو وقت یا پیسہ نہیں دے پاتی۔ تو وہ ان کی محبت اور خلوص کے شاکی ہو جاتے ہیں۔ صورت دیگر اولاد کے پاوں کی زنجیر بنے رہتے ہیں۔ جب تک زندگی کا خاتمہ نہ ہو۔

مشرقی سماج اپنے عیب چھپاتا ہے۔ اپنے جھوٹے تفاخر میں زندہ ہے۔ جب کہ اصل میں ناکارہ ہو چکا ہے۔ اور نسلوں کی نشونما اور خوشیوں کو کھا رہا ہے۔ یہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے اور اس کا جلد از جلد خاتمہ ہونا چاہئے۔

مدینہ کی ریاست

ایک تو ہم تاریخ پڑھتے نہیں ہے، دوسرے تاریخ کے بارے میں جو ہمیں پڑھایا گیا، وہ تقدیس میں لپیٹا سب اچھا کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ میں حضور پاک ﷺ نے اسلامی ریاست قائم کی۔ جو 41 ہجری تک قائم رہی۔ جس کے بعد اقتدار کا مرکز مدینہ سے دمشق میں منتقل ہوگیا مدینے کی ریاست کے ابتدائی دور میں ہمیں قبائلی سادگی، قبائلی جمہوریت کے آثار ملتے ہیں، جنہیں ہمارے ہاں اسلامی اقدار اور خصوصیات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اور اسی نے ہمیں رومان میں مبتلا کرر کھا ہے۔ جب کہ ان کا تعلق صرف انفرادی اور جزوی سطح تک تھا۔ ہمیں مدنی معاشرے اور طرز سیاست میں یہ اقدار اور اخلاقیات نظر نہیں آتی۔ ریاست اور دولت کے پھیلاو کے ساتھ ہی اسلامی حکمرانی ابتدائی قبائلی سادہ روی سے موروثی جاگیری شہنشائیت میں بدل گئی 632 عیسوی میں حضور ﷺ کی وفات ہوئی۔ اس وقت تک مدینہ کی ریاست کا دائرہ کار ایران اور شام کی سرحدوں تک جا چکا تھا۔ مدینہ کی ریاست میں سیاسی استحکام کس قدر تھا ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا، میرے بعد فوراً فتنے پیدا ہوجائیں گے۔ یہ خدشات کیوں تھے اس لیے کہ مدنی ریاست مختلف متضاد اور متحارب گروہوں پر مشتمل تھی۔ یمنی اور حجازی قبائل، مکہ اور مدینے کے قبائل، انصار اور مہاجرین، قریش کے امرا اور غرباء کے درمیان، بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان، حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان، ازدواج رسول ﷺ دو گروہوں میں تقسیم تھی۔ منافقین اور مسلمین کے درمیان وغیرہ۔ ان سب کے درمیان سخت مخاصمت، لڑائی، اقتدار کی کشمکش پائی جاتی تھی، جس میں کسی لحاظ اور رواداری کی کوئی بات نہ تھی۔ اسلامی اخوت کی یہ تھی تصویر جو ہمارے ہاں کس طریقے سے سنہرے دور کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ جنہوں نے ایک دوسرے کے خلاف بدزبانی کرنے، سازشیں کرنے، قتل

کرنے، قبضہ کرنے سے کبھی گریز نہ کیا اور یہ کام حضور پاک ﷺ کی وفات کے دن سے شروع ہو گیا۔ یعنی ہم سادہ لوح مسلمان جن مثالی اقدار کو اسلام کا شاخسانہ سمجھتے ہیں، ان پر حضور پاک ﷺ کی زندگی کے فوری بعد عمل نہ ہوسکا آج چودہ سو سال بعد کوئی اس پر روبہ عمل ہونے کا یقین کرے۔ وہ سادہ لوحی ہوسکتا ہے، یا فریب نظری میں مبتلا۔ اسلام ضابطہ حیات ہے، اور اس کے پاس دنیا کا بہترین سیاسی نظام ہے، اس کے تناظر میں اسلامی ریاست کی پہلی منتقلی اقتدار کو ہوتے ملاحظہ فرمائیں۔

جون 632 عیسوی حضور پاک ﷺ جب اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ بتایا جاتا ہے، وہ کافی تکلیف کی حالت میں تھے، روایات کے مطابق انہوں نے اشارے سے کچھ لکھوانے کی خواہش کا اظہار کیا، لگتا تھا، وہ جانشینی کے بارے میں کوئی ہدائت دینا چاہتے تھے۔ تاکہ ان کے بعد ممکنہ فتنہ و فساد پیدا نہ ہو۔ لیکن ان کے پاس جتنے بھی صحابہ کرام موجود تھے، ہر ایک نے ان کی سنی ان سنی کردی۔ اس ڈر سے کہ کوئی ایسا جانشین نہ نامزد کردیں، جو ان میں سے کچھ کو قبول نہ ہو۔ چنانچہ سب نے لیت و لعل سے کام لیا بلکہ انہوں نے حضور پاک ﷺ کے سامنے ایسا رویہ اور ایسے کلمات ادا کئے۔ جو آج توہین رسالت کے زمرے میں سمجھے جاسکتے ہیں۔ طبری کے مطابق کسی نے کہا، آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے اور سرسامی کیفیت طاری ہے۔ جس کی وجہ سے (نعوذ باللہ) آپ ﷺ غیر ارادی باتیں کر رہے ہیں آپ کیا لکھوانا چاہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے تنگ آکر فرمایا: جاؤ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ چنانچہ 8 جون کو آپ کی روح مبارک نکلتے ہی انصار کا ایک گروہ سعد بن عبادہ سقیفہ بنی ساعدہ میں اکھٹا ہوگیا۔ دوسری طرف حضرت علیؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، فاطمہؓ کے گھر جمع ہوگے۔ تیسری طرف مہاجرین ابوبکرؓ کے ہاں جمع ہو گے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا، ہمیں انصاری بھائیوں کے پاس جانا چاہیے۔ انصاریوں نے تجویز کیا، کہ دو امیر ہونے چاہیئے، ایک انصار سے اور ایک مہاجروں سے (اسلامی اخوت و اتحاد کی کوئی بات نہیں ہورہی) ابوبکرؓ نے کہا، یہ ممکن نہیں، ہم امیر ہونگے اور تم وزیر۔ عمرؓ نے ابوبکرؓ کی بیعت کرنے میں پہل کی۔ انصار میں سے کچھ نے کہا، ہم تو علیؓ کی بیعت کریں گے۔ زیاد بن کلیب سے مروی ہے۔ عمرؓ علیؓ کے مکان پر آئے وہاں طلحہؓ، زبیرؓ اور دوسرے مہاجر موجود تھے، عمرؓ نے کہا، چل کر ابوبکرؓ کی بیعت کرو، ورنہ میں اس گھر کو آگ لگا کر تم سب کو جلا دوں

گاز بیر تلوار نکال کر عمر کی طرف بڑھے۔ مگر فرش پر پاؤں الجھ جانے کی وجہ سے گر گے اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی، تب دوسرے لوگوں نے زبیر پر یورش کر کے ان کو قابو کر لیا۔ عبداللہ بن عبدالرحمان سے مروی ہے۔ ہر طرف سے لوگ آ کر ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے اور قریب تھا، سعد کو روند ڈالتے۔ عمرؓ نے کہا، اللہ اس کو ہلاک کرے اور اس کو قتل کر دو سعد نے عمر کی داڑھی پکڑ لی۔ عمرؓ نے کہا اسے چھوڑ دو، اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا۔ تو تمہارے منہ میں ایک دانت نہ رہے گا ابوبکرؓ نے کہا عمرؓ خاموش رہو۔ اس موقعہ پر نرمی برتنا زیادہ سودمند ہے۔ عمرؓ نے سعد کو چھوڑ دیا۔ سعد نے کہا اگر مجھ میں اٹھنے کی طاقت ہوتی مدینے کی تمام گلی کوچے میں اپنے حامیوں سے بھر دیتا۔ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش وحواس جاتے رہتے روایات میں لکھا ہے، سعد نے اس کے بعد کبھی ابوبکرؓ کی امامت میں نماز نہ پڑھی۔ نہ ان سے کلام کیا۔ ابن ہشام، طبری اور ابن خلدون کے بیانات سے یہ حقیقت عیاں ہے، کہ ابھی رسول ﷺ اللہ کا جسد خا کی دفنایا بھی نہ گیا تھا۔ کہ صحابہ کرام میں خلافت پر شدید اختلافات پیدا ہو گے۔ اس سلسلے میں شیعان علی کا اپنا موقف ہے۔ ان کے مطابق حضرت علی نے حضرت ابوبکر کی مجبورا بیعت کی تھی، اس لیے کہ حضرت فاطمہ کا گھر جلا دینے کی دھمکی دی گئی تھی ایک روایت میں لکھا ہے، کہ ابوسفیان علی کے پاس آ کر کہنے لگے، میں مدینے میں ایک عجیب شورش دیکھتا ہوں، جس کا حل صرف کشت وخون ہے۔ حکومت قریش کے سب سے کم تعداد والے قبیلے میں چلی گئی ہے۔

ہم ان تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا دل وجان سے احترام کرتے ہیں۔ مضمون کا مقصد صرف یہ بتانا مقصود ہے، کہ مدینے کی اسلامی ریاست میں پہلا انتقال اقتدار انتہائی شورش اور تنازعے میں طے پایا ہمیں یہاں نہ تو کوئی اسلامی اخوت، اتحاد، بھائی چارہ، تقوی کا میرٹ نظر آتا ہے۔ سب نسلی، قبائلی عصبیتوں کے ساتھ بحث مباحثہ کر رہے ہیں۔ کوئی اصول، قانون، قوائد و ضوابط موجود نہ تھے۔ ایک دھکا شاہی کا منظر تھا۔ جس میں بالاخر حضرت ابوبکر صدیقؓ پہلے خلیفہ بنے۔ ہمیں فرقہ وارانہ اختلافات سے کچھ غرض نہیں۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں، اس سے ملتے جلتے بلکہ ممکنہ طور پر اس سے بھی سنگین واقعات ہوئے تھے۔

حضرت ابوبکر کو خلافت مل گئی۔ ان کو جن جھگڑوں سے سامنا ہوا، ان میں ایک حضرت فاطمہؓ کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی اولاد ہونے کے ناطے وراثت سے اپنا حصہ

مانگا جوان کو نہ دیا گیا۔ اس سلسلے میں باغ فدک کا واقع مشہور ہے۔ کہا گیا، آپ کی نسل کو وراثت میں حصہ دینا منع ہے۔ دوسری شورش یہ ہوئی۔ کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد کچھ قبائل اور لوگ تیزی سے اسلام کو چھوڑنا شروع ہو گے۔ اس کا مطلب ہے، کہ فتح مکہ تک اور اس کے بعد جو لوگ جوق در جوق اسلام قبول کئے تھے، وہ وقتی جبر کا نتیجہ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فتنہ ارتداد کے انسداد کے لیے گیارہ فوجی مہمات کا بندوبست کیا۔ لوگوں کو خوف اور دہشت سے دوبارہ اسلام لے آنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جو لوگ اسلام چھوڑ گے، انہوں نے مسلمانوں پر مظالم کئے ان کو جلایا، اور ان کے جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ لیکن خالد بن ولیدؓ نے بھی اسی طرح ان کو جلایا، سنگسار کیا اور بعض کو پہاڑوں سے گرایا کچھ کو کنوؤں میں ڈال کر تیروں سے چھلنی کیا۔ روایات میں درج ہے۔ خالد بن ولید کی جانب سے بدویت دہشت اور ہوس غنیمت کا مظاہرہ عہد رسالت میں بھی ہوا تھا۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے بعد اسے تبلیغ اسلام کے لیے بنی جذیمہ کی جانب بھیجا تھا اور جنگ کا حکم نہیں دیا تھا۔ خالد بن ولیدؓ کی ان کے ساتھ پرانی خاندانی دشمنی تھی۔ خالدؓ کے کہنے پر سارے قبیلے نے ہتھیار ڈال دیئے، ان کے نہتے ہونے کے بعد خالد بن ولیدؓ نے ان کی مشکیں بندھوایں اور پھر بہت سوں کو قتل کر دیا۔ اس کی اطلاع جب رسول اللہ ﷺ کو ملی تو انہوں نے علی ابن طالبؓ کو حکم دیا، کہ وہ ان لوگوں کے پاس جا کر ان لوگوں کا خون بہا ادا کرے۔ مسیلمہ کذاب کے خلاف مہم جوئی کی قیادت خالد بن ولیدؓ کے پاس تھی۔ جس میں مسیلمہ کی فوج کے ستر ہزار لشکری مارے گے۔ یمامہ کے ایک قبائلی سردار مجاعہ سے خالد نے آدھا مال واسباب، مزروعہ وغیر مزروعہ، باغات، قیدی کرنے کی پیشکش کی۔ مجاعہ نے ربع مال واسباب پر صلح کی پیشکش کی۔ خالد نے اس کی بیٹی کو مانگ لیا۔ جب ابوبکرؓ کو اطلاع ملی، تو انہوں نے خالد کو غصہ میں خط لکھا، کہ تم عورتوں سے نکاح کر رہے ہو۔ حالانکہ 1200 مسلمانوں کا خون تمہارے صحن میں اب تک تازہ ہے۔ ایک مہم میں مسلمانوں نے دس ہزار مشرکوں کو قتل کیا۔ بہت سے لونڈی غلام اور مال غنیمت حاصل کیا۔ جس کو امرا اسلام نے مسلمان مجاہدین میں تقسیم کر دیا اور خمس (پانچواں حصہ) حضرت ابوبکر کو بھیج دیا مسلمانوں نے کفار کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا اور مال غنیمت میں دو ہزار تیز رفتار اونٹنیاں ملی۔ قبائلی عصبیت صرف بدوؤں میں غالب نہ تھی، مدینہ اور مکہ جید حضرات بھی اسی طرح مغلوب تھے۔ مرتدین کے خلاف پے در پے کامیابیوں نے حضرت ابوبکرؓ کی حکومت کو مستحکم کر دیا۔ پورے عرب میں وقار اور دبدبہ قائم ہو گیا اور قریش کے لیے خوشحالی کے

دروازے کھل گے۔ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے اسلامی لشکر میں بہت اضافہ کر کے اسے بیرونی فتوحات پر لگا دیا۔ خالد بن ولیدؓ کی ہرمز پر فتح کی خبر اتنی خوش کن تھی، کہ ابو بکرؓ نے ہرمز کا ایک لاکھ درہم کا تاج خالد کو بخش دیا۔ پھر خالد نے ایران کے شہنشاہ کو خط لکھا۔ اللہ کا شکر ہے۔ جس نے تمہارے نظام کو قتل اور تمہاری تدابیر کو ابتر کر دیا ہے۔ تم ہمارے دین میں داخل ہو جاو، ہم تم کو چھوڑ دیں گے۔ میرے ساتھ وہ لوگ ہیں جو موت کے اس قدر عاشق ہیں۔ جس قدر تم زیست کے ہو۔ اسلام لے آو، ورنہ جزیہ ادا کرو۔ دریائے یرموک کے نزدیک ایک اور ہم میں رومیوں کے ایک لاکھ بیس ہزار افراد کو پانی میں غرق کر دیا گیا۔ جس سے شام اور لبنان پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ حضرت ابو بکرؓ 63 سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔ آپ کا عہد دو سال تین مہینہ رہا۔ ان کی وصیت تھی، کہ مسلمان جہاد میں مصروف رہیں اور خلافت میں کوئی فتنہ برپا نہ ہو۔

حضرت عمرؓ کا دور:

حضرت ابو بکرؓ کے بعد خلافت حضرت عمر نے سنبھالی۔ ابو بکرؓ نے عجمی ممالک کے خلاف جہاد جاری رکھنے کی جو وصیت کی تھی، اسے حضرت عمرؓ نے جاری رکھا۔ ہرمز کی جنگ میں ہارنے سے دجلہ کے حصے کو چھوڑ کر عراق پر قبضہ ہو چکا تھا۔ ایران کے شاہی خاندان طوائف الملوکی کا شکار اور باہم برسرپیکار تھے۔ ابو عبیدہؓ کی قیادت میں ایران کی فتح کی جانب پہلا شدید قسم کا معرکہ ہوا۔ ابو عبیدہؓ نے دشمن کے اطراف کا تمام علاقہ برباد کر دیا اور مال غنیمت جمع کر لیا۔ بکثرت لونڈیاں اور غلام بنائے گے۔ کھانے کے بے شمار ذخیرے ہاتھ آئے، آس پاس کے عربوں کو بلا کر بھی کہا کہ وہ جتنا لے جانا چاہتے ہیں لے جائیں۔ نرسی جو کسری کا خالہ زاد بھائی تھا، اس کے تمام خزانے قبضے کر لئے۔ ابو عبیدہؓ نے جب خمس کا حصہ حضرت عمر کو ارسال کیا، تو ساتھ لکھا، اللہ تعالی نے ہم کو وہ چیزیں کھانے کے لیے عطا کی ہیں، جن کی سلاطین فارس حفاظت کرتے تھے وہاں اعلی نسل کے پھلوں کے باغات تھے، جو صرف شاہی خاندان کے لیے ہی مخصوص تھے۔ فارس کو فتح کرنے کے کئی حملے کئے جاتے رہے۔ کسری کے پاس مسلم سفیر بھی بھجوائے جاتے رہے، جس میں یہی پیغام ہوتا، اسلام قبول کرو، یا جزیہ دو، یا لڑنے کے لیے تیار ہو جاو۔ مختلف مقامات پر خون ریز معرکے ہوتے رہے۔ جن میں دو طرفہ ہزاروں لوگ بے دردی سے قتل کئے جاتے رہے۔ ایران ایک ترقی یافتہ

اعلی تہذیب کا حامل ملک تھا۔ بادشاہ اور روساء کے اتنے عالیشان محلات اور باغات تھے اور شہر اتنے خوبصورت تھے، کہ صحرا میں رہنے والے تمدنی اور تہذیبی لحاظ سے پس ماندہ عرب اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مال غنیمت ساٹھ ہزار لشکریوں میں تقسیم ہوا خمس کا حصہ بھی خلیفہ کو روانہ کر دیا گیا۔ ان میں ہزارہا نہایت قیمتی نوادرات اور عجائبات تھے۔ کسری کا قالین ۹۰ گز لمبا اور ۶۰ گز چوڑا تھا۔ اس میں پھول پتیاں، درخت، نہریں، تصویریں، سونے کی تاریں اور جواہرات جڑے تھے۔ جب یہ چیزیں مدینہ پہنچی، دیکھنے والے مسلمانوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئی۔ حضرت علیؓ نے رائے دی، اس کو کاٹ کر لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے!!! حضرت علیؓ کے حصے آنے والا ٹکڑا تیس ہزار درہم میں فروخت ہوا ابن خلدون لکھتا ہے، مال غنیمت کا پانچواں حصہ جو مدینہ پہنچا، اس کی مالیت تین کروڑ تھی، ہر سوار کو نو نو ہزار اور نو نو گھوڑے ملے۔ فاروق اعظمؓ مال غنیمت اور جواہرات کے ڈھیر دیکھ کر رو پڑے عبدالرحمانؓ نے کہا، امیر المومنین، یہ تو مقام شکر ہے، آپ کیوں رووے، فاروق اعظمؓ نے جواب دیا۔ جس قوم کو اللہ تعالی دولت دیتا ہے، اس میں رشک اور حسد آ جاتا ہے عرب قبائل عہد رسالتؐ سے ہی مال غنیمت پر جھگڑا کرتے آ رہے تھے۔ ان میں غنیمت کا لالچ اسلامی اخوت، ایثار، اتحاد سے زیادہ غالب تھا۔ قبائلی عصبیت کا یہ حال تھا، کہ ہر قبیلے کی الگ الگ مسجدیں ہوتی تھی اور وہ جدا جدا محلوں میں رہتے تھے۔ مدائن میں مچھروں نے عربوں کو تکلیف دی، تو سعدؓ نے عمرؓ کو اس بارے میں لکھا، عمرؓ نے جواب دیا، عربوں کی حالت اونٹ سی ہے، ان کو ایسی جگہ راس نہیں آ سکتی، جو اونٹ کو راس نہ آئے حضرت عمرؓ کی ایران پر فتح سے وسطی ایشیا اور ہندوستان پر فتح کے دروازے کھل گے۔ حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملے کا پس منظر کچھ یوں ہے، کہ ایرانی غلام جو مال غنیمت میں اپنے عرب مالک مغیرہ بن شعبہ کو ملا تھا، اس کے خلاف شکائت لے کر آیا، کہ اس کا مالک اس سے زیادہ خراج (اس کی کمائی کا حصہ) وصول کرتا ہے۔ غلام ہنرمند تھا، اور وہ آہن گری، نقاشی اور نجاری وغیرہ کے مختلف کام کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا، چونکہ تم کئی کام کرتے ہو، اس لیے تمہارا خراج زیادہ نہیں۔ اس واقعے کے تیسرے دن حضرت عمرؓ صبح کی نماز کے لیے مسجد تشریف لائے۔ صف بندی کے بعد جب حضرت عمرؓ نے تکبیر پڑھی۔ وہ غلام نمازیوں میں گھس آیا اور امیر المومنین پر خنجر کے چھ وار کر دئے۔ قاتلانہ حملہ کے تیسرے دن حضرت عمرؓ نومبر 644 میں انتقال کر گے۔ آپ کی ازدواج میں ام کلثوم بنت علی بھی شامل تھی (دونوں کی عمروں کا فرق اور رشتے داری کے ملحوظ

بے کا اندازہ آپ خود کرلیں، حضرت عمر کی بیٹی حضور کی بیوی تھیں)۔

مدینہ ریاست کے کار پرداز عربوں کی فطرت سے واقف تھے۔ کہ ان کو دو چیزیں پسند ہیں، لڑائی اور مال غنیمت لوٹنا۔ اسلامی فتوحات کی سرعت اور وسعت کو دیکھ کر عش عش کرنے والوں کے لیے عرض ہے۔ مسلمانوں سے پہلے اور بعد میں کئی فاتح حملہ آوروں نے اسی طرح کی فتوحات حاصل کی تھی۔ قیصر اعظم، اسکندر اعظم، نپولین اعظم، چنگیز خان، تاتاری اور تیمور کی فتوحات ایسی ہی شاندار تھی۔ چنانچہ فتوحات کا اسلام کے کسی معجزے یا جذبے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ قومیں جب اٹھی، تو اسی طرح اپنے اپنے زمانے میں طوفان کھڑے کئے۔ رومن ایمپائر، جرمن ایمپائر، ہسپانوی ایمپائر اپنے عروج میں حضرت عمرؓ کی سلطنت سے زیادہ عروج پر تھی۔ دوسری بات جو اہم ہے، جب اسلام کی فتوحات شروع ہوئی، تو اہل فارس اور اہل روم کی مملکتوں میں قومی، معاشرتی اور مذہبی انتشار کا زمانہ تھا۔ مال غنیمت کے چار حصے لشکریوں میں تقسیم ہوتے تھے، وہ اس فائدے کے حصول کے لیے بڑے جوش سے لڑتے تھے۔ حضرت عمرؓ جبراً مفتوح رعایا کو اسلام میں داخل کرنے کے بھی خلاف تھے۔ آپ کے سیاسی کردار میں عرب نیشنل ازم اور قبائلی چھاپ نمایاں تھی۔ آپ نے شام کے دورے کے دوران معاویہ کا شاہانہ تزک واحتشام دیکھ کر کہا، معاویہ یہ کیا فرعونیت ہے۔ اسی طرح بیت المقدس کے دورے کے دوران یزیدؓ، ابوعبیدہؓ، اور خالد بن ولیدؓ کی حریری قباؤں کو دیکھ کر برہم ہوئے اور کہا، دو ہی برس میں تم نے عجمیوں کی عادتیں اپنا لیں۔ اس برہمی کا تعلق اسلام کے اصولوں سے نہیں تھا، حضرت عمرؓ پرانے پس ماندہ قبائلی اقدار کی نمائندگی کر رہے تھے اور اسلام کے فاتح کمانڈر نئی مال و دولت اور نئی طرز زندگی سے آشنا ہو رہے تھے۔ بے پناہ مال غنیمت آنے سے عربوں کی زندگی کا معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی، نقشہ بدل رہا تھا۔ ایرانی لونڈیوں اور غلاموں کے ذریعے لہولعب کی محفلیں جمنے لگی۔ اسلامی مساوات کا خاتمہ ہونے لگا۔ دولت کی فراوانی اتنی تھی، کہ حضرت عمرؓ پوچھا کرتے تھے، کہ اس دولت کا کیا کروں۔ چنانچہ انصار اور قریش کے قبائل کی مردم شماری کرا کر ایک رجسٹر بنایا گیا، تاکہ تمام گروہوں اور طبقات میں حسب مراتب دولت کی تقسیم کی جاسکے۔ ازدواج مطہرات کا دس دس ہزار کا وظیفہ مقرر ہوا، حضرت عائشہؓ کو دو ہزار زیادہ دئے گے۔ حسنؓ، حسینؓ، سلمان فارسیؓ، ابوذر غفاریؓ کو پانچ پانچ ہزار درھم تنخواہ لگی۔ لیکن ایران کی فتح کے بعد عربوں اور ایران میں جو شدید تضاد پیدا ہو گیا،

وہ خطرناک نتائج کا حامل تھا۔ عربوں کی معیشت خانہ بدوش اور قبائلی تھی۔ ان کو کھانے پینے اور رہنے سہنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ ایران کے پارسیوں میں علوم عقلیہ کا بہت فروغ ہو چکا تھا اور وہ ایک بلند تہذیبی سطح پر زندگی گزار رہے تھے۔ چنانچہ ان میں ایک قومی تشخص اور تفاخر تھا۔ بدوی عربوں نے ایران کی تہذیب و ثقافت کو برباد کیا، ان کے شہروں کو لوٹ لیا، ایرانیوں نے زردتشت مذہب چھوڑ کر اسلام تو قبول کر لیا، لیکن عربوں کے خلاف ان کی نفرت کم نہ ہو سکی۔ ابن خلدون لکھتا ہے، کہ حضرت سعد بن وقاصؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا، کہ ہمیں یہاں بہت سے کتب خانے ملے ہیں۔ ان کے بارے میں کیا کیا جائے، اگر اجازت ہو تو مسلمانوں میں ان کو بھی تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمان جاری کیا، ان کو دریا برد کر دو۔ اگر ان میں ہدایت ہے، تو وہ ہمیں پہلے ہی مل چکی ہے اور اگر گمراہی ہے، تو اس کی ہمیں ضرورت نہیں۔ چنانچہ کتابوں کو دریا برد کیا اور کچھ کو جلا دیا گیا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے ایران سے جو اسیران جنگ لائے گے، ان میں ایرانی شہنشاہ یزدگرد کی تین بیٹیاں بھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ان کو فروخت کرنے کا جب حکم دیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا، شہزادیوں کے ساتھ تو ایسا سلوک ٹھیک نہیں جو عام لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ نے قیمت بیت المال میں جمع کروا کر ان تینوں لڑکیوں کو خرید لیا، ان میں سے ایک لڑکی حضرت عمرؓ کے بیٹے عبداللہؓ کو، ایک لڑکی حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے محمدؓ کو اور ایک اپنے صاحب زادے حضرت حسینؓ کو دی۔ انہیں کے بطن سے زین العابدینؓ پیدا ہوئے تھے۔ ایرانیوں پر اموی استبداد کا نتیجہ تھا، انہوں نے مسلمان ہونے کے بعد عربوں کے اس گروہ کا ساتھ دیا، جو اموی حکمرانوں کے خلاف تھا، یعنی حضرت علیؓ اور ان کی اولاد۔ ایرانیوں کے تحت شعور میں مزدک، زردتشت اور مانی تعلیمات جاں گزیں رہیا ور وہ مختلف صورتوں میں باہر نکلتی رہی۔ جس نے بالآخر اسلامی دور کی سب سے بڑی عقلی تحریک معتزلہ کا روپ دھارا۔

حضرت عثمانؓ کا دور:

مغیرہ بن شعبہ کی روائت ہے۔ جب عمرؓ مدفون ہوئے، تو میں حضرت علیؓ کے پاس آیا۔ آپ غسل کر کے اس طرح کی پوشاک پہنے ہوئے تھے، لگتا تھا، انہیں یقین ہے، کہ وہ خلیفہ بنائے جائیں گے۔ حضرت عمرؓ نے کوئی جانشین مقرر نہیں کیا تھا، البتہ ایک مجلس شوری بنا دی تھی۔ جس کو کہا

گیا تھا، کہ ان کی وفات کے تین دن تک کوئی نئے خلیفہ کا کثرت رائے سے فیصلہ کر لیں۔ طبری لکھتا ہے۔ کہ حضرت عمرؓ نے حضرت صہیبؓ سے کہا، جب علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ، عبدالرحمانؓ، طلحہؓ، سعدؓ، اکٹھے ہو جائیں، تم ان کے سر پر کھڑے ہو جانا، اگر پانچ متفق ہوں اور ایک اختلاف کرے، تم اس کا سر تلوار سے پاش پاش کر دینا اور اگر چار متفق ہوں، تو باقی دونوں کی گردنیں اڑا دینا اگر تین متفق ہوں، تو عبداللہ بن عمرؓ کو ثالث بنانا اور جو متفقہ فیصلے سے انحراف کرے، ان کو قتل کرا دینا، آج کل اسلامی احیاء پسند خلافت راشدہ کے ابتدائی دور کو آج کے مروجہ جمہوری نظام کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے، کہ اس اسلامی سیاسی نظام میں اپوزیشن کی کوئی گنجائش نہ تھی، پہلے خلیفہ کے وقت بھی زبردستی بیعت کروائی گئی تھی، اسلام میں کسی سیاسی نظام وضوابط کا کوئی خاکہ نہیں۔ وہ قبائلی معاشرت کے لوگ تھے، امیر کے چننے پر بیعت کا طریقہ قبل اسلام سے تھا۔ کسی نے خلافت کا دعوی تقوی اور نیکی کی بنیاد پر نہیں مانگا، بلکہ رسول ﷺ سے قرابت، یا قبائلی برتری کی بنیاد پر جتایا گیا۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے چوتھے روز نماز فجر کے وقت انصار و مہاجرین اور امراء لشکر اکٹھے ہوئے۔ وہاں ایک دوسرے کے خلاف تلخ کلامی شروع ہو گئی، بنو اُمیہ اور بنو ہاشم کے درمیاں تکرار ہونے لگی، قرابت داری کی بنیاد پر ایک دوسرے کو سپورٹ کرنے لگے۔ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ بیعت کر لی، جو کہ حضرت عثمانؓ کے رشتے دار تھے۔ حضرت علیؓ نے اس پر اعتراض کیا، تو عبدالرحمانؓ نے فرمایا، علیؓ تم مخالفانہ دلیل حجت نہ کرو، میں نے غور و فکر سے فیصلہ کیا ہے۔ تمام روایات اس پر شاہد ہیں، کہ جانشینی کا فیصلہ خوشگوار ماحول میں نہیں ہوا تھا اور مبینہ طور پر علیؓ یہ کہتے ہوئے چلے گے، کہ اس اجتماع کے بعد تلواریں بے نیام ہونگی اور امانت میں خیانت ہو گی۔ حضرت عمرؓ نے جو مجلس شوری مقرر کی تھی، اس میں کوئی انصاری صحابی شامل نہیں تھا۔ حضرت عثمانؓ کا تعلق بنو امیہ سے تھا۔ اسلام قبائلی عصبیت کا خاتمہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ حضرت عثمانؓ نے خلیفہ بنتے ہی مقربین کو مقرر کردہ وظائف کے علاوہ ان کے لیے انعام کرام جاری کر دیئے۔ حضرت زبیرؓ کو چھ لاکھ اور حضرت طلحہؓ کو دو لاکھ درہم دیئے اور وہ قرض بھی معاف کر دیئے، جو انہوں نے حضرت عثمانؓ سے لیے تھے۔ حضرت عمر نے قریش کے لوگوں پر پابندی لگائی ہوئی تھی، کہ مدینے سے باہر اسلامی مفتوحہ علاقوں میں نہیں جا سکتے، انہیں خدشہ تھا، صحابہ کرام ان کے خلاف کوئی فتنہ کھڑا نہ کر دیں۔

حضرت عمرؓ کا خیال تھا، حضور کے ساتھ قرابتداری کے لحاظ سے ان کے جو وظیفے مقرر ہیں، وہ ان کی ضروریات کے لیے کافی ہیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے نقل و حرکت کی پابندی ہٹالی اور قریش قبیلے کے لوگ نئی سلطنت کی وسعتوں میں پھیل گے۔ انہوں نے اپنے پیسے کو تجارت میں لگا کر اسے مزید دوگنا کرنا شروع کر دیا، یعنی مدینے میں بھی امراء کا ایک نیا طبقہ تشکیل پانے لگا۔ جسے قریش ارسٹوکریسی کہہ سکتے ہیں۔ ان صحابہ کرام نے حضور کے ساتھ اپنی قبائلی قرابت داری کا خوب استعمال کیا اور مختلف شہروں میں بڑی بڑی ملکیتیں اور جائیدادیں بنالی۔ لوگ بھی ان کے قریب ہو گے، کہ آئندہ یہ خلیفہ بھی بن سکتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر دنیاوی متاع کے طلب گار تھے، ثواب آخرت کے کم۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں مصر اور شمالی افریقہ کے علاقوں پر چڑھائی کی گئی اور ان کو فتح کر لیا گیا۔ حضرت عثمانؓ نے کوفہ میں بنو امیہ کے دباو کے تحت سعد بن ابی وقاصؓ کو معزول کیا اور ولید بن عقبہؓ کو یمنی قبائل کی مخالفت کی وجہ سے گورنری سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یعنی کوفہ شہر کا طرز زندگی قبائلی تھا، وہاں اسلامی اتحاد نام کی چیز نہیں تھی۔ چنانچہ کوفہ میں فتنہ و فساد ابھرنے شروع ہو گے۔ مفتوحہ علاقوں کی زمینوں اور دولت پر کن کا قبضہ ہونا چاہئے، مقامی اور فاتحین کے درمیان کیا تعلقات ہونے چاہیئے۔ حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کی زمینوں پر عربوں کے قبضہ کی مخالفت کی تھی۔ وہ مقامی لوگوں کے پاس چھوڑ دی تھی، تا کہ ان کی آمدنی عام مسلمانوں کے کام آتی رہے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اہل حجاز اور عام عربوں کو مفتوحہ علاقوں میں جا کر زمینیں خریدنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ حجاز کے کئی صحابہ کرام بڑی بڑی منقولہ اور غیر منقولہ املاک کے مالک بن گے۔ انہوں نے شاداب اور زرخیز زمینیں خرید لی۔ جس سے عراق اور دوسرے علاقوں میں بڑی بڑی جاگیریں وجود میں آگئی۔ جب کہ دوسری طرف غلام، مزدور اور موالی طبقات میں اضافہ ہو گیا۔ عرب معاشرہ کچھ اس طرح کے طبقات میں تقسیم ہو گیا۔ فاتح عرب، مفتوح عجمی، قریش سرمایہ دار اور جاگیردار، کھیت مزدور اور چھوٹے مالکان اراضی۔ بے زمین عرب بدو اور شہروں کا چھوٹا درمیانہ طبقہ۔ زراندوزی کے مسئلے پر ہی حضرت ابوذر غفاریؓ کا شام کے گورنر معاویہ سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ جب انہوں نے دولت مندوں کے خلاف اور غریبوں کی حمائت میں تقریر کی۔ جس پر معاویہ نے حضرت عثمانؓ کو لکھا، کہ ابوذر غفاریؓ میرے لیے مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ خلیفہ عثمانؓ نے جواب میں لکھ بھیجا، کہ ابوذر غفاریؓ کے ساتھ نرمی برتو اور اس کو میرے پاس

بھیج دو۔ حضرت ابوذرؓ کی حضرت عثمانؓ کے ساتھ دولت کی بے جا تقسیم پر کئی بار تلخ کلامی ہوتی رہی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ عثمانی عہد میں اسلامی مملکت میں طبقاتی تضاد کس قدر شدید ہو گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ پر کنبہ پروری کے الزامات عائد ہوتے رہے۔ سنی عقیدہ علماء، اہل بیت کے معاملے میں جو اختلاف بعد میں شدت اختیار کر گے، اسے ایک یہودی عبداللہ بن سبا کی بنائی سازش کے سر منڈھتے ہیں۔ وہ بصرے اور کوفے میں جا کر تقریریں اور پروپیگنڈا کرتا تھا، کہ اے مسلمانوں تمہارے درمیان آل رسول موجود ہے، اور تم ان کو خلیفہ نہیں بناتے، ڈاکٹر طہٰ حسین ابن سبا کی اس داستان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان کے پاس ایک لاکھ دینار اور دس لاکھ درہم تھے۔ کئی جاگیریں تھی، بے شمار اونٹ اور گھوڑے تھے۔ زبیرؓ نے ترکے میں پچاس ہزار دینار، ایک ہزار گھوڑے اور ہزار لونڈیاں چھوڑی تھی۔ طلحہؓ کی عراق سے غلہ کی یومیہ آمدنی ایک ہزار دینار تھی۔ عبدالرحمانؓ کے اصطبل میں ایک ہزار گھوڑے، ہزار اونٹ، دس ہزار بکریاں، چوراسی ہزار دینار، زید بن ثابتؓ نے ایک لاکھ دینار کی جاگیر علاوہ سونے چاندی کی اینٹیں چھوڑی۔ ان کے بصرہ، کوفے، اسکندریہ، مصر میں بڑے بڑے مکانات تھے۔ یہ تھی وہ صحابہ کرام پر مشتمل حکمرانہ اشرافیہ، جو ابتدا میں دولت سے نفرت کرتے تھے، وہی مال و زر جمع کرنے کے شوقین ہو گے۔ مساوات محمدی کی ساری مثالیں دھری کی دھری رہ گئی اور ان پر انسانی فطرت غالب آ گئی۔ اس طرح کے واقعات بھی ہوئے، خمس بیت المال میں جمع کرانے کی بجائے اسے خرد برد کر دیا اور رشتے داروں کو جی بھر مال و زر جمع کرنے کا موقع دیا گیا۔ اپنے لوگوں میں بلا حق زمینیں الاٹ کی جاتی رہی۔ قبائلی معیشت و معاشرت کا جاگیرداری معیشت و معاشرت میں ڈھلنا ایک تاریخی عمل تھا۔ فتوحات، خون ریزی، اور استبدادیت تاریخی عمل کے لازمی اجزا تھے۔ ان کے کردار میں دین اسلام کا نہ کوئی رول ملتا ہے، نہ مداخلت۔ اسلام کی مثالی اقدار جو آج لوگوں کو سنائی جاتی ہیں، خیالوں کے علاوہ حقیقی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتی۔

حضرت عثمانؓ کا قتل اور حضرت علیؓ و دیگر صحابہ سے مناقشہ اسلامی تاریخ کو جب ہم پڑھتے ہیں، تو صحابہ کرام کے درمیان ایسے افسوسناک واقعات اور ایک دوسرے کے بارے میں کہے گے ایسے کلمات ملتے ہیں، جن کے بارے میں عام مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان میں نفاق کی یہ حالت تھی، تو عام مسلمانوں کے رویوں میں کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ پر

کنبہ پروری کا الزام لگاتے رہے اور عثمانؓ سمجھتے تھے، کہ علیؓ مفسدین کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کا موقف تھا، کہ ان سے پہلے کو دو بزرگوں (ابوبکرؓ اور عمرؓ) نے بنظر احتساب اپنے قرابت داروں کو فائدے نہ پہنچائے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ اپنے قرابت داروں کا خیال رکھا کرتے تھے۔ اور ان کی مدد کرتے تھے' عبداللہ بن مسعودؓ ایک صحابی تھے، وہ بھی حضرت عثمان کی طرز حکومت پر سخت نقطہ چینی کرتے تھے۔ ایک دن جب وہ مسجد نبوی میں داخل ہوئے، تو حضرت عثمانؓ منبر رسول پر خطبہ دے رہے تھے۔ تو حضرت عثمانؓ نے کہا، ''لوگو! تمہارے پاس ایک چھوٹا سا رینگنے والا جانور آیا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے آواز دی، اے عثمان آپ رسول اللہ کے مصاحب کو ایسا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے کہنے پر عبداللہ بن مسعودؓ کو نہ صرف زبردستی مسجد سے نکال دیا گیا، بلکہ زدوکوب کیا اور ان کی پسلی ٹوٹ گئی۔ اسی طرح ایک بار حضرت عمار بن یاسر نے حضرت عثمان کی اقربا پروری پر مذمت کی۔ جب انہوں نے بیت المال سے ایک ہیرا نکال کر اپنے خاندان میں سے کسی کو دے دیا۔ حضرت عثمانؓ نے اسے اتنا پیٹا، کہ وہ بے ہوش ہو گے۔ لوگ انہیں اٹھا کر ام المومنین ام سلمہ کے گھر لے آئے۔ روائت کے مطابق ایک اور موقعے پر حضرت عمارؓ کے ساتھ بدکلامی کی گئی اور لاتیں ماریں۔ جب کہ وہ بوڑھے اور ضعیف تھے۔ امیر معاویہؓ سات سال تک شام، لبنان، فلسطین کے حکمران ہونے کی وجہ سے طاقتور اور ایک کامیاب حکمران بن گے تھے اور ان میں خود خلیفہ بننے کی خواہش پیدا ہونی فطری تھی۔ معاویہ بہت اچھا منتظم تھا۔ اس نے نظم وضبط بھی اچھی طرح قائم کر رکھا تھا۔ حضرت عثمان کا انجام یوں ہوا، کہ کچھ مصری بلوائی حضرت عثمانؓ کی خلافت کے خلاف مدینے میں آ گے، انہوں نے حضرت علیؓ، طلحہؓ، اور ذبیرؓ کی مدد چاہی، لیکن انہوں نے بلوائیوں کی عثمان کے خلاف کسی حرکت کی حمائت کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن بلوائیوں نے مدینے کی گلیوں میں اللہ و اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے حضرت عثمانؓ کا محاصرہ کر لیا اور خیمہ زن ہو گے۔ حضرت عثمانؓ نے مختلف شہروں میں امداد کے لئے خطوط بھیجے اور منبر پر چڑھ کر مصری باغیوں کے خلاف سخت زبان میں تقریر کی۔ اس پر دو طرفہ ہنگامہ بڑھ گیا، لوگوں نے ایک دوسرے پر پتھر مارنے شروع کر دیئے۔ حضرت عثمان بھی سنگباری کی ذد میں آ گے، اور وہ بے ہوش کر منبر سے گر پڑے۔ ان کا محاصرہ چالیس دن برقرار رہا۔ اس دوران قتل و غارت بھی ہوتا رہا۔ بنو امیہ نے حضرت علیؓ پر الزام لگایا، کہ سب کچھ اس نے کروایا

بھیج دو۔ حضرت ابوذرؓ کی حضرت عثمانؓ کے ساتھ دولت کی بے جا تقسیم پر کئی بار تلخ کلامی ہوتی رہی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ عثمانی عہد میں اسلامی مملکت میں طبقاتی تضاد کس قدر شدید ہو گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ پر کنبہ پروری کے الزامات عائد ہوتے رہے۔ سنی عقیدہ علماء، اہل بیت کے معاملے میں جو اختلاف بعد میں شدت اختیار کر گے، اسے ایک یہودی عبداللہ بن سبا کی بنائی سازش کے سر منڈھتے ہیں۔ وہ بصرے اور کوفے میں جا کر تقریریں اور پروپیگنڈا کرتا تھا، کہ اے مسلمانوں تمہارے درمیان آل رسول موجود ہے، اور تم ان کو خلیفہ نہیں بناتے، ڈاکٹر طہ حسین ابن سبا کی اس داستان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان کے پاس ایک لاکھ دینار اور دس لاکھ درہم تھے۔ کئی جاگیریں تھی، بے شمار اونٹ اور گھوڑے تھے۔ زبیرؓ نے ترکے میں پچاس ہزار دینار، ایک ہزار گھوڑے اور ہزار لونڈیاں چھوڑی تھی۔ طلحہؓ کی عراق سے غلہ کی یومیہ آمدنی ایک ہزار دینار تھی۔ عبدالرحمانؓ کے اصطبل میں ایک ہزار گھوڑے، ہزار اونٹ، دس ہزار بکریاں، چوراسی ہزار دینار، زید بن ثابتؓ نے ایک لاکھ دینار کی جاگیر علاوہ سونے چاندی کی اینٹیں چھوڑی۔ ان کے بصرہ، کوفے، اسکندریہ، مصر میں بڑے بڑے مکانات تھے۔ یہ تھی وہ صحابہ کرام پر مشتمل حکمرانہ اشرافیہ، جو ابتدا میں دولت سے نفرت کرتے تھے، وہی مال وزر جمع کرنے کے شوقین ہو گے۔ مساوات محمدی کی ساری مثالیں دھری کی دھری رہ گئی اور ان پر انسانی فطرت غالب آ گئی۔ اس طرح کے واقعات بھی ہوئے، خمس بیت المال میں جمع کرانے کی بجائے اسے خرد برد کر دیا اور رشتے داروں کو جی بھر مال وزر جمع کرنے کا موقع دیا گیا۔ اپنے لوگوں میں بلاحق زمینیں الاٹ کی جاتی رہی۔ قبائلی معیشت و معاشرت کا جاگیرداری معیشت و معاشرت میں ڈھلنا ایک تاریخی عمل تھا۔ فتوحات، خون ریزی، اور استبدادیت تاریخی عمل کے لازمی اجزا تھے۔ ان کے کردار میں دین اسلام کا نہ کوئی رول ملتا ہے، نہ مداخلت۔ اسلام کی مثالی اقدار جو آج لوگوں کو سنائی جاتی ہیں، خیالوں کے علاوہ حقیقی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتی۔

حضرت عثمانؓ کا قتل اور حضرت علیؓ و دیگر صحابہ سے مناقشہ اسلامی تاریخ کو جب ہم پڑھتے ہیں، تو صحابہ کرام کے درمیان ایسے افسوسناک واقعات اور ایک دوسرے کے بارے میں کہے گے ایسے کلمات ملتے ہیں، جن کے بارے میں عام مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان میں نفاق کی یہ حالت تھی، تو عام مسلمانوں کے رویوں میں کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ پر

کنبہ پروری کا الزام لگاتے رہے اور عثمانؓ سمجھتے تھے، کہ علیؓ مفسدین کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کا موقف تھا، کہ ان سے پہلے کو دو بزرگوں (ابوبکرؓ اور عمرؓ) نے بنظر احتساب اپنے قرابت داروں کو فائدے نہ پہنچائے۔' حالانکہ رسول اللہ ﷺ اپنے قرابت داروں کا خیال رکھا کرتے تھے۔ اور ان کی مدد کرتے تھے' عبداللہ بن مسعودؓ ایک صحابی تھے، وہ بھی حضرت عثمان کی طرز حکومت پر سخت نقطہ چینی کرتے تھے۔ ایک دن جب وہ مسجد نبوی میں داخل ہوئے، تو حضرت عثمانؓ منبر رسول پر خطبہ دے رہے تھے۔ تو حضرت عثمانؓ نے کہا، ''لوگو! تمہارے پاس ایک چھوٹا سا رینگنے والا جانور آیا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے آواز دی، اے عثمان آپ رسول اللہ کے مصاحب کو ایسا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے کہنے پر عبداللہ بن مسعودؓ کو نہ صرف زبردستی مسجد سے نکال دیا گیا، بلکہ زدوکوب کیا اور ان کی پسلی ٹوٹ گئی۔ اسی طرح ایک بار حضرت عمار بن یاسر نے حضرت عثمان کی اقربا پروری پر مذمت کی۔ جب انہوں نے بیت المال سے ایک ہیرا نکال کر اپنے خاندان میں سے کسی کو دے دیا۔ حضرت عثمانؓ نے اسے اتنا پیٹا، کہ وہ بے ہوش ہو گے۔ لوگ انہیں اٹھا کر ام المومنین ام سلمہ کے گھر لے آئے۔ روائت کے مطابق ایک اور موقعے پر حضرت عمارؓ کے ساتھ بدکلامی کی گئی اور لاتیں ماریں۔ جب کہ وہ بوڑھے اور ضعیف تھے۔ امیر معاویہؓ سات سال تک شام، لبنان، فلسطین کے حکمران ہونے کی وجہ سے طاقتور اور ایک کامیاب حکمران بن گے تھے اور ان میں خود خلیفہ بننے کی خواہش پیدا ہونی فطری تھی۔ معاویہ بہت اچھا منتظم تھا۔ اس نے نظم و ضبط بھی اچھی طرح قائم کر رکھا تھا۔ حضرت عثمان کا انجام یوں ہوا، کہ کچھ مصری بلوائی حضرت عثمانؓ کی خلافت کے خلاف مدینے میں آ گے، انہوں نے حضرت علیؓ، طلحہؓ، اور ذبیرؓ کی مدد چاہی، لیکن انہوں نے بلوائیوں کی عثمان کے خلاف کسی حرکت کی حمائت کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن بلوائیوں نے مدینے کی گلیوں میں اللہ و اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے حضرت عثمانؓ کا محاصرہ کر لیا اور خیمہ زن ہو گے۔ حضرت عثمانؓ نے مختلف شہروں میں امداد کے لئے خطوط بھیجے اور منبر پر چڑھ کر مصری باغیوں کے خلاف سخت زبان میں تقریر کی۔ اس پر دو طرفہ ہنگامہ بڑھ گیا، لوگوں نے ایک دوسرے پر پتھر مارنے شروع کر دیئے۔ حضرت عثمان بھی سنگباری کی زد میں آ گے، اور وہ بے ہوش کر منبر سے گر پڑے۔ ان کا محاصرہ چالیس دن برقرار رہا۔ اس دوران قتل و غارت بھی ہوتا رہا۔ بنوامیہ نے حضرت علیؓ پر الزام لگایا، کہ سب کچھ اس نے کروایا

ہے۔ ایک اور روائت میں ہے، کہ مصری بلوائی واپس چلے گے تھے۔ کہ راستے میں انہوں نے حضرت عثمانؓ کے ایک جاسوس کو پکڑ لیا، جس پاس ایک خط تھا، جس میں مصر کے حاکم کو لکھا تھا، کہ وہ مصر پہنچنے پر ان بلوائیوں کو قتل کر دے۔ چنانچہ مذکورہ بلوائی غصہ کے مارے پھر مدینہ واپس حضرت عثمانؓ کے پاس آگے، حضرت عثمانؓ نے کہا، کہ انہوں نے ایسا کوئی خط نہیں لکھا۔ میرے خلاف دو مسلمان گواہ لے کر آؤ۔ بحث و تکرار چلتا رہا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا، کہ اگر میں تمہاری مرضی کے مطابق کام اور تقرریاں کروں، تو میری حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ حضرت عثمانؓ نے دستبردار ہونے سے بھی انکار کر دیا۔ واقعہ کے مطابق محمد بن ابوبکرؓ تیرہ افراد کے ساتھ حضرت عثمانؓ کے گھر گھسے۔ محمد بن ابوبکرؓ نے عثمانؓ کی داڑھی پکڑ لی اور کہنے لگے، معاویہؓ نے تم کو کیا فائدہ پہنچایا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا، اے میرے بھتیجے، میری داڑھی چھوڑ دے۔ راوی کہتے ہیں، میں نے دیکھا، انہوں نے ایک شخص کو اشارہ کیا، جو بھالا لے کر گیا، اور ان کا سر پھوڑ ڈالا اور پھر سب لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور ان کو قتل کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کی زوجہ نائلہ درمیان میں حائل ہوئی، لیکن سودان کی تلوار سے ان کی انگلیاں نصف ہتھیلی کے ساتھ کٹ کر دور جا گری اور پھر اس نے ایک اور وار کر کے خلیفہ کی گردن تن سے جدا کر دی اس کے بعد بلوائیوں نے گھر کا سارا مال و متاع لوٹ لیا اور مدینہ میں ان کے قتل کا اعلان کر دیا۔ باغیوں نے قتل کرنے کے بعد ان کو دفنانے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ بڑی مشکل سے رات کو چھپ کر چند لوگوں نے حضرت عثمانؓ کو دفنایا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ بائیس روز رہا۔ اور وہ 2 مئی 656 کو قتل ہوئے۔ یہ ہے، وہ اسلام کا سیاسی نظام اور مدینے کی ریاست جسے آج کی مسلمان نسلوں کو سنہرے دور کے طور پر پیش کر کے بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ ان مولویوں سے جب پوچھیں گے، تو وہ کسی ایک فرد یا کچھ افراد پر الزام دھر دیں گے۔ حالانکہ ان واقعات میں کسی طرح کا بھی کوئی اخلاقی معیار، چھوٹے بڑے کی تمیز، کوئی تہذیب کا شائبہ نظر نہیں آتا اور یہ سب وہ لوگ تھے، جو حضور ﷺ صحبت میں رہ چکے تھے۔

حضرت علیؓ کا عہد اور حضرت عائشہؓ کے ساتھ جنگ اقتدار:

رسول اللہ کی وفات کے بعد اہل مدینہ خلافت کا فیصلہ کبھی اتفاق رائے سے نہ کر سکے۔ اتحاد اسلامی کا جلوہ کبھی نمودار نہ ہوا۔ عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ کے لوگ حضرت علیؓ کے پاس

آئے، اور اصرار سے ان کو خلیفہ بننے کو کہا۔ سعد بن ابی وقاصؓ، عبداللہ بن عمرؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ اس عہدے کے ممکنہ امیدوار ہو سکتے تھے۔ سب سے پہلے مسجد نبوی میں حضرت علیؓ کے ہاتھ پر مالک اشتر نے بیعت کی۔ طلحہؓ کو کچھ پس و پیش ہوا، اس پر اشتر نے تلوار کھینچ کر کہا، اگر بیعت نہ کرو گے، تو ایک وار میں پیشانی کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ مجبوراً طلحہؓ نے ہاتھ بڑھایا اور پھر زبیرؓ نے بھی ان کی تقلید کر دی۔ سعد بن ابی وقاصؓ نے کہا، جب سب بیعت کر لیں گے، وہ پھر کریں گے۔ لیکن میں جھگڑا نہیں کروں گا۔ عبداللہ بن عمرؓ نے بھی یہی کہا۔ تو اشتر نے غصہ سے کہا، حکم ہو، تو اس کی گردان اڑا دوں۔ روساء انصار میں سے کئی اہم لوگوں نے بیعت نہ کی۔ بنوامیہ کے لوگ جان بوجھ کر بیعت سے بچنے کے لیے شام روانہ ہو گے۔ اور کچھ اہم شخصیات مکہ چلی گئی۔ یعنی حضرت علیؓ کی بیعت انتشار و افتراق کے ماحول میں ہوئی۔ جس سے پچھلے تین خلیفہ گزر چکے تھے۔ اب تو مسلمانوں میں خانہ جنگی کے خطرات مضمر تھے۔ بیعت کے بعد طلحہؓ اور زبیرؓ نے حضرت علیؓ سے مطالبہ رکھ دیا، کہ جن لوگوں نے عثمانؓ کو قتل کیا ہے، ان سے قصاص لیا جائے۔ حالانکہ باغیوں کے ساتھ طلحہ خود بھی شامل تھے اور وہ ان کو نماز پڑھوایا کرتے تھے۔ خلیفہ ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے سب سے پہلے عثمانؓ کے مقرر کردہ تمام والیوں کو معزول کر دیا۔ اس لیے کہ وہ ان کی موجودگی میں اپنے اقتدار کو مستحکم نہیں دیکھ رہے تھے۔ حضرت عثمانؓ سے بغاوت کرنے والے زیادہ تر غریب لشکری، غلام اور اعرابی شامل تھے۔ لیکن ان کی روایات اور عادتیں بدوی تھی۔ حضرت علیؓ نے جب مختلف شہروں میں اپنے گورنر بھیجے تو انتشار اور مزاحمت کی وجہ سے ان میں کئی اپنے چارج نہ سنبھال سکے اور ان کو راستے سے ہی واپس مدینے آنا پڑا۔ حضرت علیؓ حالات کو سنبھالنے کی کوششیں کرتے رہے، امیر معاویہ اور ابوموسیٰ الشعری کو بیعت کے لیے خط لکھے۔ شام سے امیر معاویہؓ نے جواب میں کورا خط بھیج دیا، کوفہ کے بارے ابوموسیٰ نے لکھا، کچھ سے زبردستی آپ کی بیعت لی ہے، اور کچھ راضی ہیں۔ حضرت علیؓ اور ان کے مخالفوں کے درمیان فرق یوں تھا، ایک طرف ابھرتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کے حامی اور حضرت علیؓ کی طرف وہ لوگ تھے، جو پرانے شکستہ قبائلی سادہ طرز زندگی کو باقی رکھنا چاہتے تھے۔ حضرت علیؓ نے حالات کو دیکھتے ہوئے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کی محصوری کے دوران مکے چلی گئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی، واللہ حضرت عثمانؓ مظلوم مارے گئے ہیں، میں ان کے خون کا بدلہ لوں گی۔ اہلیان قریش حضرت عائشہؓ کے ساتھ

تھے، وہ علی سے بیعت کے وقت مکے چلے گئے تھے۔ تعجب کی بات یہ ہے، کہ قاتلین عثمانؓ کا سرغنہ حضرت عائشہؓ کا بھائی محمد بن ابوبکرؓ تھا۔ مکہ میں منادی کروائی گئی، ام امومنین عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ بصرہ جارہے ہیں، جس کو اسلام سے ہمدردی ہے اور عثمانؓ کے قتل کا بدلہ لینا ہو، وہ ہمارے ساتھ چلے، جس کے پاس سواری نہ ہو، اسے سواری مہیا کی جائے گی۔ چنانچہ چھ سو آدمی چھ سو اونٹوں پر سوار ہو کر علاوہ مکہ و مدینہ کے ایک ہزار آدمیوں کے یہ قافلہ بصرہ روانہ ہوا۔ راستے میں اور لوگ بھی ملتے گے جس سے ان کی تعداد تین ہزار ہوگئی۔ ابن خلدون اور طبری سے واضح ہے، کہ ان کا مقصد عثمانؓ کے قاتلوں سے بدلہ لینا ہی نہیں تھا، حضرت علیؓ کو خلافت سے ہٹانا بھی تھا۔ طلحہؓ اور زبیرن مدینے میں حضرت علیؓ سے بیعت کر چکے تھے۔ لیکن مکہ جا کر بیعت سے منحرف ہوگئے۔ حضرت عائشہؓ کا لشکر جب بصرہ کے قریب پہنچا، تو ان کا سامنا علی کے مقرر کردہ گورنر عثمان بن حنیفؓ اور اس کے سپہ سالار حکیم بن جبلہ کے لشکر سے ہوگیا۔ دونوں لشکر ایک دوسرے کے قریب ڈیرہ زن ہوگئے۔ صبح کے وقت ایک شور سا اٹھا، کوئی کہہ رہا تھا، کون ہے گستاخ جو حضرت عائشہؓ کو گالیاں دے رہا ہے۔ یہ سن کر حکیم نے اس شخص کے سینے میں نیزہ مارا اور اسے قتل کر دیا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے حامیوں اور عائشہؓ کے لشکروں کے درمیان جنگ شروع ہوگئی، شام تک دونوں طرف کے کافی لوگ مارے اور کہیں زیادہ زخمی ہوئے۔ عثمان بن حنیفؓ کے ساتھیوں کی کمر ٹوٹ گئی اور انہوں نے صلح کے لیے پکارنا شروع کر دیا۔ طے یہ پایا، کہ مدینہ ایک قاصد بھیج کر متعین کیا جائے، کہ طلحہؓ اور زبیرؓ سے بیعت زبردستی لی گئی تھی یا ان کی اپنی مرضی سے۔ اگر انہوں نے خوشی سے حضرت علیؓ کی بیعت کی تھی، تو حضرت عائشہؓ کا گروپ بصرہ چھوڑ کر واپس چلا جائے گا اور اگر زبردستی بیعت لی گئی تھی، تو پھر عثمان بن حنیفؓ بصرہ کو خالی کر دے گا۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے، کہ اس عہد نامے میں حضرت عثمانؓ کے قتل کا کوئی ذکر نہیں یعنی معاملہ صرف خلافت کی کھویا کھوئی کا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص ایک بہانہ تھا۔ قاصد اسامہ جب مدینہ پہنچا، تو اسے کچھ لوگوں نے قسم کھا کر کہا، کہ بیعت زبردستی لی گئی تھی۔ یہ معلوم ہونے پر حضرت علیؓ نے عثمان بن حنیفؓ کو لکھا، جماعت کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا، کوئی گروہ بندی نہیں تھی۔ لیکن اگر یہ دونوں بیعت کو توڑنا چاہتے ہیں، تو کوئی علاج نہیں۔ تم بصرہ کو خالی کر دو۔ اسی دوران حضرت عائشہؓ کے حامیوں اور حنیفؓ کے حامیوں کے درمیان مسجد میں جھگڑا ہوگیا۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھیوں نے عثمان بن حنیفؓ کے

بہت سے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ اور چالیس آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ عثمان بن حنیفؓ کو پکڑ کر طلحہؓ اور زبیرؓ کے پاس لایا گیا، لوگوں نے ان کو خوب لاتوں سے روندا، ان کے بال اکھیڑ دیئے۔ عثمان بن حنیفؓ رسول ﷺ کے صحابی تھے۔ چنانچہ عائشہؓ نے ان کی جان بچالی اور ان کو قید کرنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے عثمان کو چالیس کوڑے مارے، داڑھی کے بال نوچے۔ مونچھیں اور پلکیں اکھیڑ دیں اور قید کر دیا ایک اور روائت کے مطابق جب حضرت عثمانؓ بعد میں حضرت علیؓ کے پاس پہنچے، تو انہوں نے علیؓ کو کہا، آپ نے مجھے داڑھی والا بھیجا تھا، اب میں آپ کے پاس سفید داڑھی کے بغیر آیا ہوں۔ بصرہ میں عثمانؓ کے ساتھ اس بہیمانہ سلوک کے بعد حکیم بن جبلہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر یہ کہتا ہوا نکلا۔ اگر میں عثمانؓ کی مدد نہ کروں تو اس کا بھائی نہیں۔ وہ حضرت عائشہؓ کے لئے بری زبان استعمال کر رہا تھا۔ وہاں پھر تو تو میں میں ہو کر عائشہؓ کے لشکر کے ساتھ سخت لڑائی ہوئی۔ حکیم بن جبلہ مارا گیا۔ جب مصالحت کی سب کوششیں ناکام ہوگئی، ایک صبح بصرہ کے نزدیک مسلمانوں میں زبردست خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار کر خود شریک ہوئی۔ لڑائی کے تھوڑی دیر بعد حضرت عائشہؓ کے ساتھیوں کے پاوں اکھڑ گے۔ طلحہؓ کے پاوں میں تیر لگا، اور وہ اس زخم سے جاں بحق ہوگے۔ زبیرؓ کو نماز کے دوران ایک شخص نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد لڑائی میں پھر تیزی آگئی، ام المومنین نے لڑائی روکنے کی غرض سے کعب کو کہا، تم ناقہ چھوڑ دو، اور قرآن شریف کو لے کر میدان میں جا کر لوگوں کو بلاو۔ حضرت علیؓ کا لشکر آگے بڑھا، کعب پر تیر برسے اور قرآن شریف کو اٹھائے وہی ڈھیر ہوگے۔ تیر ام المومنین کی طرف برسنے لگے۔ نیزہ اور تلواروں کی آوازوں سے کان پھٹ رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ کی بددعاوں کی آوازیں میدان جنگ میں گونج رہی تھی۔ ام المومنین کی اونٹنی کو جو لوگ گھیرے ہوئے تھے، ان میں چالیس سے ستر لوگ کام آئے لڑائی تھم نہیں رہی تھی۔ حضرت علیؓ نے بلند آواز ام المومنین کے ناقے پر حملہ کرنے کا حکم دیا تاکہ یہ لوگ منتشر ہو جائیں۔ عائشہؓ کے اونٹ کے پاوں پر ایک تیر آ کر لگا، اور ان کا اونٹ گر گیا۔ امیر المومنین ام المومنین کے پاس آ کر کہنے لگے، اے ماں، تو کیسی ہے انھوں نے کہا، کاش میں آج سے بیس سال پہلے مر جاتی، کہتے ہیں، حضرت علیؓ نے بھی ایسے ہی تاسف کا اظہار کیا۔ اس جنگ میں دونوں فریق کے دس ہزار لوگ کام آئے ایک روائت میں بصرہ کے مقتولین کی تعداد دس ہزار تھی اور پانچ ہزار کوفی تھے۔ میدان جنگ سے لوگوں کے کٹے ہوئے ہاتھ پاوں تلاش کرنے کا

کام شروع ہوا۔ اتنے ہاتھ پاؤں کسی جنگ میں پہلے نہیں کٹے گئے تھے۔ ہلاک شدگان میں بڑے بڑے صحابہ کرام شامل تھے۔ جن کو نبی اکرم ﷺ نے جنت کی بشارتیں دی ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے جو اخوت، مساوات، اتحاد کا سبق دیا تھا، وہ کہاں گیا۔ طبری لکھا ہے، انہیں شیطان نے گمراہ کر دیا تھا جب کہ کھری بات یہ ہے، ہم صحابہ کرام کو تقدس کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور ان کو دین کے راہنما کی حیثیت دیتے ہیں، جب کہ وہ سیاست اور دین کو الگ الگ سمجھتے تھے۔ سچ یہ ہے، اسلام میں سیاست اور دین ہمیشہ الگ الگ رہے ہیں۔ سیاست اور دین کو ایک کرنے کا فلسفہ بیسویں صدی میں ایجاد کیا گیا تھا۔ صحابہ کرام ہوں یا بعد کے مسلم خلفاء اور بادشاہ وہ تقاضائے بشریت سے کبھی بلند نہیں رہے۔ دنیاوی تقاضے دنیاوی طریقوں سے ہی پورے کئے گے۔ اقتدار اور دنیاوی معاملات میں انہوں نے دین کو خاطر میں نہ لایا۔

شہادت حضرت علیؓ:

جنگ جمل میں ہزاروں مسلمانوں کا آپس میں خون بہنے کے بعد بھی اقتدار کا مسئلہ حل نہ ہوا۔ قبائلی، گروہی اور طبقاتی مفادات پر خون ریز کشمکش جاری رہی۔ سازشیں، ثالثیاں، مذاکرات اور لڑائی جاری رہی، علیؓ اور معاویہؓ کے حامیوں کے درمیان جنگ صفیان بھی ہوئی۔ امیر معاویہ دمشق میں اپنے اقتدار کو مستحکم کر چکا تھا۔ جب کہ کوفہ میں علی کی خلافت ڈانواڈول رہی۔ صورت یہ تھی، کہ عملی طور پر مدینہ کی ریاست میں تین خلیفہ بیک وقت تھے ایک خارجیوں کا امیر عبداللہ راسبی تھا، لقب تھا، گھٹنوں والا طویل سجدے کرتے کرتے اس کے گھٹنے سیاہ ہو چکے تھے۔ وہ مذہبی عقائد میں انتہا پسند تھا۔ اس کے نزدیک ہر گناہ سے بندہ کافر ہو جاتا تھا۔ خارجیوں کی بھی باغیانہ سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دن انہوں نے ایک صحابی عبداللہ بن حباب کو قتل کر دیا۔ ان کی لونڈی کا پیٹ چاک کیا، اور اس کا بچہ نکال کر پھینک دیا۔ اس پر شیعان علیؓ کا کہنا تھا۔ کہ شامیوں سے پہلے خارجی فتنہ کا قلع قمع ضروری ہے۔ جب حضرت علیؓ کوفے میں داخلی انتشار کو ختم کر رہے تھے، تو انہیں مصر سے اطلاع آئی۔ ان کا مقرر کردہ والی محمد بن ابو بکر عمرو بن العاصؓ کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ اور امیر معاویہ کی فوج نے مصر کو فتح کر لیا۔ جب حضرت عائشہؓ کو اپنے بھائی کی موت کی اطلاع ملی، تو انہیں بڑا افسوس ہوا۔ اس واقعے کے بعد حضرت عائشہؓ ہر نماز کے بعد معاویہ اور عمرو کے لیے بد دعا

کرتیں۔ حضرت علیؓ نے جاریہ کی زیر سرکردگی ایک فوجی دستہ زیاد کی امداد کے لیے بصرہ بھیجا۔ ابن الحضرمی (معاویہ کا کمانڈر) نے شکست کھا کر ایک گھر میں پناہ لی، جاریہ نے گھر کو آگ لگا کر ابن الحضرمی اور اس کے سارے ساتھیوں کو جلا دیا۔ ان دنوں حضرت علیؓ کے خلاف چاروں طرف سے بغاوتیں ہو رہی تھی۔ خارجیوں نے لوگوں کو زکوۃ دینے سے بھی منع کر دیا۔ وہ لوگ جو پہلے عیسائی تھے، اور اب مسلمان ہو چکے تھے۔ جب انہوں نے مسلمانوں کے درمیان یہ اختلافی صورت دیکھی، تو کہنے لگے اس سے بہتر تو وہ دین تھا۔ جس کو ہم نے چھوڑا تھا۔ یہ کیسا دین ہے، جو آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانے سے نہیں روکتا۔ نا یہ دین ایک دوسرے کا مال چھیننے سے روکتا ہے، چنانچہ وہ دوبارہ دین عیسائیت کی طرف چلے گے۔ ان کو مرتدین قرار دے کر قتل کر دیا گیا۔ (حوالہ طبری)۔ امیر معاویہؓ نے سفیان ابن عوفؓ کو چھ ہزار کا لشکر دے کر ہیت پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ اور وہاں جو ملے اس کو لوٹ لینے کو کہا۔ وہاں بھی علیؓ کے حامیوں کو شکست ہوئی۔ انہی دنوں معاویہ کے سترہ سو لشکریوں نے تیاپر حملہ کیا۔ اس لشکر کے امیر کو حکم تھا، کہ جو راستے میں دیہات آئیں، ان سے زکوۃ وصول کرو اور جو انکار کرے، اسے قتل کر دو۔ تین ہزار کا ایک جتھہ معاویہؓ نے حجاز کو فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ حضرت علیؓ کا مقرر کردہ مدینے کا گورنر حضرت ابوایوب انصاریؓ ڈر کر بھاگ گیا۔ اس کے بعد معاویہؓ کے کمانڈر بسر نے یمن کا رخ کیا۔ وہاں بھی علیؓ کے مقرر کردہ عبداللہ بن عبدلمدانؓ کو بیٹے سمیت قتل کیا۔ راستے میں عبیداللہ بن عباسؓ کے دو چھوٹے بچے ملے، ان کو بھی بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ حضرت علیؓ کا کمانڈر جاریہ مدینے کی طرف بڑھا۔ وہاں حضرت ابو ہریرہؓ نماز پڑھایا کرتے تھے۔ وہ جاریہ کے خوف سے مدینہ چھوڑ کر چکے گے۔ جاریہ کو یہ معلوم ہوا، تو اس نے کہا، اللہ کی قسم اگر میں اس بلی والے کو پا لیتا، تو اس کی گردن اتار دیتا۔
جاریہ نے مدینے کے لوگوں کی حسن ابن علیؓ کی بیعت کروائی اور کوفہ لوٹ گیا۔ اسی سال حضرت علیؓ اور معاویہ کی جنگ بندی ہو گئی۔ عراق حضرت علیؓ کے پاس اور شام معاویہ کے پاس رہے۔ طے پایا، دونوں ایک دوسرے کے علاقے پر لشکر کشی نہیں کریں گے۔ دونوں خود کو امیر المومنین کہلواتے تھے۔ بشمول خارجی، تینوں فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے تھے۔ اسی سال ۴۰ ہجری میں حضرت علیؓ کو شہید کر دیا گیا۔ جنگ نہروان میں بچ جانے والے خوارجیوں نے سوچا، ہم اپنی جانوں پر کھیل کر کیوں نہ ان دونوں گمراہ کن امیر المومنین کو قتل کر دیں۔ ایک نے

حضرت علیؓ کو، ایک نے معاویہؓ اور ایک نے عمرو بن العاصؓ کو قتل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ تاکہ لوگ ان کے ظلم سے نجات پا جائیں۔ حضرت علیؓ مسجد میں آئے، دروازے میں ابن ملجم اور شبیب چھپے ہوئے تھے۔ شبیب نے لپک کر تلوار چلائی، علی آگے بڑھ گئے۔ تلوار دروازے پر پڑی، ابن ملجم نے بڑھ کر پیشانی پر تلوار کا وار کیا۔ شبیب بھاگ گیا، لوگوں نے ابن ملجم کو پکڑ لیا۔ حضرت علیؓ کسی کو اپنا خلیفہ مقرر کئے بغیر اللہ کو پیارے ہو گئے، حالانکہ لوگوں نے ان سے اس بارے استفسار بھی کیا تھا۔ ادھر دوسرا شخص برک جو معاویہؓ کو قتل کرنے کے لیے مقرر ہوا تھا، اس نے بھی معاویہ پر حملہ کیا۔ لیکن زخم معمولی ہوا۔ پلٹ کر برک گرفتار کر لیا۔ اس نے کہا مجھے مت ماریں، میں آپ کو خوشخبری سناتا ہوں۔ کہ میرے دوسرے بھائی نے حضرت علیؓ کو مار دیا ہے۔ لیکن معاویہ نے برک کو قتل کر دیا۔ علیؓ عہدہ خلافت پر پونے پانچ سال مامور رہے۔ انہوں نے نو شادیاں کی۔ ان سے چودہ لڑکے اور سترہ لڑکیاں ہوئی۔ تاہم انہوں نے ترکے میں کوئی سونا چاندی نہ چھوڑا۔

ہم نے مدینے کی ریاست کے عنوان سے چاروں خلفائے راشدین کی سیاسی تاریخ انتہائی اختصار سے عام مسلمان کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ہمارا کسی فرقہ بندی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب کچھ اسلامی تاریخی کتابوں میں درج ہے۔ جس طرح اسلام میں کچھ بھی ایسا نہیں، جس پر سب متفق ہوں، یا وہ حتمی طور پر تصدیق شدہ ہو۔ جتنے علماء ہیں۔ جتنے مفسرین ہیں۔ جتنے مورخ ہیں۔ سب ایک دوسرے سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں۔ اب آپ خود اندازہ کر لیں۔ مدینے کی ریاست کو کیا آج جدید مہذب زمانے میں ایک سیاسی مثالی نظام کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔؟ یہاں مدینے کی ریاست کا چورن بیچنے والے بے شمار ہیں۔ نقشہ ہم نے دکھا دیا ہے۔ یہ دیگ کا دانہ تھا۔ خود اسلامی تاریخ پڑھیں۔ آپ کو ہوش اڑانے والے واقعات ملیں گے۔

نوٹ: اس مضمون میں جو بھی کہا گیا ہے۔ وہ سارا مواد ہماری مذہبی روایات کی کتابوں میں موجود ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ تو پھر ان مذہبی کتابوں سے یہ مواد نکال دینا چاہئے۔ یا ان کتابوں کو باطل قرار دے دینا چاہئے۔ ہم نے اس مضمون کے اقتباسات کتاب مسلمانوں کی سیاسی تاریخ زاہد چوہدری مصنف ہے، ادارہ مطالعہ تاریخ نے اسے چھاپا ہے۔ اس میں سینکڑوں کے حساب سے سب حوالے موجود ہیں۔ جن سے کوئی بھی شخص واقعاتی تصدیق کر سکتا ہے۔

پرومیتھیس کی رہائی، شیلے اور انسان

اگرچہ انسان کی نمود آب و خاک کے عناصر سے تشکیل پائی تھی پھر بھی اس نے دیکھا کہ فطرت ایک بڑے حریف کے طور پر اس کے سامنے کھڑی ہے، صاحب شعور ہونے کی وجہ سے وہ دیگر مخلوقات کی طرح فطرت کے رحم و کرم پر زندہ نہیں رہ سکتا تھا، اپنی بقا کے لیے فطرت کے ساتھ تفہیم اور تسخیر کا رشتہ استوار کرنا ضروری تھا چنانچہ جہاں تفہیم کے عمل میں اسطور سے، مذہب اور فلسفہ وادب نے جنم لیا وہاں تسخیر کی سطح پر سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی میں انسان نے دسترس حاصل کی۔

انسانی تہذیب کا یہ سفر اس کے ذہنی (Intellcitual) درد کی ایک طویل داستان بھی ہے، وسیع و عریض فطرت کے سامنے انسان کہاں کھڑا تھا اور اس کا انسان کے ساتھ کیا رشتہ تھا۔ اس کی وضاحت کی خاطر قدیم مفکرین نے نہایت اعلیٰ پائے کی داستانیں تخلیق کیں۔ ایسی ہی ایک داستان یونانی دیومالا کے ایک کردار پرومیتھیس کے نام سے مشہور ہے، پرومیتھیس کے لغوی معنی دور اندیش کے ہیں، دراصل یہ کردار دیومالائی ہونے کے باوجود انسان کی علامت ہے اور اس کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے، یہ پرومیتھیس ہی تھا۔ جس نے آسمانوں کے مالک زیوس سے ہنر، دانش اور تہذیب کی آگ چرا کر زمین پر لایا اور اسے انسان کے حوالے کر دیا۔

زیوس یونانی دیومالا میں سب سے عظیم دیوتا تھا، ساری کائنات کا مالک، لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ انسانوں میں تخلیق کرنے کی خدائی صفات پیدا ہو جائیں، خدائے بزرگ زیوس کے نزدیک پرومیتھس کا یہ گناہ ناقابل معافی تھا کہ اس نے حقیر خاکی اور فانی انسان کو آگ پر قدرت عطا کر دی چنانچہ بارگاہ الٰہی (زیوس) کی طرف سے پرومیتھس کو اذیت ناک ابدی سزا کا حکم سنایا گیا، سزا تجویز ہوئی کہ اسے تاابد ایک پہاڑ کی چوٹی پر باندھ دیا جائے اور ہر روز عقاب کو اس کا جگر کھانے پر مامور کر دیا جائے، رات کو وہ جگر پھر اصلی حالت پر آ جاتا تھا کہ عقاب دوسری صبح جگر کھانے کا عمل پھر

سے دہرا سکے، اسی کہانی کے مطابق زیوس کے کہنے پر حرفت سازی دیوتا (Hephaestus) نے مٹی سے ایک عورت Pandora پیدا کرتا ہے پنڈورا کو سب دیوتا اپنی اپنی پسند کے تحائف پیش کرتے ہیں، جنھیں وہ ایک باکس میں رکھ لیتی ہے (پنڈورا باکس اسی کے نام سے مشہور ہے) پنڈورا کو پرومیتھس کے بھائی کے پاس بھیجا جاتا ہے، جو بھائی کی تنبیہ کے باوجود پنڈورا سے شادی کر لیتا ہے وہاں وہ اپنے باکس کو کھولتی ہے، جس میں سے تحائف کے بجائے مصائب اور بیماریاں نکل کر انسان کو گھیر لیتی ہیں، صرف اُمید باکس کے اندر رہ جاتی ہے کہ اس کا ڈھکنا بند ہو جاتا ہے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق باکس کے اندر برائیاں نہیں نعمتیں تھیں۔ جنھیں انسانی نسل کے لیے محفوظ رکھا جا سکتا تھا لیکن انسانی تجسس کی وجہ سے باکس کا ڈھکن کھل گیا ہے اور سب نعمتیں ضائع ہو گئیں اس لیے انسان تاحیات مصائب کے گھیرے میں رہتا ہے۔

اس قصے کو قدیم یونان کے المیہ ڈرامہ نگار اسکائی لیس (Aeschylus) نے رسن بستہ پرومیتھیس (Prometheus Bound) کے نام سے دنیائے ادب کا لازوال حصہ بنا دیا، اس ڈرامے نے لوگوں کو چونکا دیا، اس لیے کہ اس میں پہلی بار خدائے بزرگ زیوس کو ظالم کے طور پر پیش کیا گیا تھا، اور انسان کی علامت پرومتھیس کو ہیرو بنایا گیا تھا، اس سے قبل پرومتھیس کو مجرم کی حیثیت حاصل تھی، جب کہ اس ڈرامے میں قادر مطلق زیوس کی طاقت اور پرومیتھیس کی ہار نہ ماننے والی قوت ارادی کو ایک عظیم تصادم کے طور پر ٹریجڈی بنا کر پیش کیا گیا، چنانچہ پرومیتھیس کا کردار بعد کے زمانوں میں انقلابیوں کے لیے حوصلے (Inspiration) کا سبب بنتا رہا۔

مذاہب، عقائد اور توہمات کی دنیا کو دیکھیں تو انسان ماورائی قوتوں کے سامنے کمزور، بے بس اور سربسجود نظر آتا ہے لیکن یہ اساطیری کہانیوں کا کمال ہے کہ انسان اور خدا کو ایک دوسرے کے مقابل معکوس رشتے میں کھڑا کر دیتی ہیں۔ یعنی ایک کی کمزوری دوسرے کی طاقت اور ایک کی طاقت دوسرے کی کمزوری کا سبب بنتی ہے، ماورائی قادر مطلق انسان کو غلامی اور بندگی کی پوزیشن لینے کی ہدایت کرتا ہے اور مجبور بھی، جب کہ انسان کے اندر کی قوت ارادی (Will Power) اسے بندگی کے Status کو قبول کرنے کے خلاف اُکساتی ہے، انسان دیوتاؤں کے آگے خوش دلی سے نہیں جھکتا تھا، وہ اس کی وقتی مجبوری تھی جب تک وہ ان قوتوں پر خود قادر نہیں ہو جاتا، یہ بات توجہ طلب ہے کہ پرومیتھیس بھی اگر جھل نہ دیتا تو وہ بھی زیوس سے آگ

حاصل نہ کر سکتا تھا۔

یہاں پر انجیل کی پیدائش کی کہانی کو بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کتاب مقدس کے مطابق جب خدا آسمان، زمین اور آدم حوا کو بنا چکا تو اس نے آدم کو کہا، تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے، لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کبھی نہ کھانا، جس روز تو نے اس کو کھایا، تو مرا، سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کیوں چاہتا تھا کہ انسان عقل اور شعور سے بے بہرہ رہے اسے نیک و بد کی پہچان نہ ہونے پائے، حالانکہ یہی وہ واحد صلاحیت ہے جس سے انسان، انسان بنتا ہے ورنہ وہ باغ عدن میں صرف ایک روبوٹ ہوتا، سمجھ شعور سے عاری اور خود سے ناآشنا، خدا انسان کو مشینی Robotic حالت میں کیوں رکھنا چاہتا تھا، مقدس کتب اس سوال کا جواب نہیں دیتی۔ یہ یاد رکھا جائے کہ پرومیتھیس کہانی میں بھی زیوس نہیں چاہتا کہ انسان کو آگ (Energy) پر دسترس حاصل ہو، بہرحال انجیل کی کہانی ہمیں بتاتی ہے، جب حوا نے سانپ سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے عورت سے کہا، (مذکورہ) پھل کھانے کے بعد تم ہرگز نہ مرو گے، خدا جانتا ہے تم نے جس دن سے کھا لیا، تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کو جاننے والے بن جاؤ گے اور ایسے ہی ہوا ان لفظوں پر غور کیجیے، 'عورت نے جب دیکھا کہ وہ پھل کھانے کے لیے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لیے خوب ہے تو خود بھی کھایا اور اپنے آدمی کو بھی دیا، تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انھوں نے اپنے آپ کو انجیر کے پتوں سے ڈھانپ لیا'۔

حیرانگی کی بات ہے وہ پھل اچھا، خوش نما، عقل دینے اور آنکھیں کھولنے والا تھا، اسے کھا کر سچ اور جھوٹ کی پہچان اور خود آگاہی پیدا ہوئی مگر یہ سب کچھ خدا کو قبول نہ تھا اس لیے اب انسان کو باغ عدن میں برداشت کرنا مشکل تھا، چنانچہ آدم کو خطا کی کا طعنہ دے کر اس زمین پر سزا کے طور پر اُتار دیا گیا۔ یونانی متھ اور الہامی قصے میں کتنی حیران کن مماثلت پائی جاتی ہے، دونوں میں مشیت ایزدی نہیں چاہتی کہ انسان میں شعور اور خودمختاری پیدا ہو۔

وقت گزرتا گیا فطرت اور انسان کے بیچ کشمکش میں انسان کو شعور، آگہی، علوم اور ٹیکنالوجی پر عبور حاصل ہوتا گیا، وہ ان قوانین کو جان گیا جس سے کائنات کے سارے مظاہر تشکیل پاتے ہیں، وہ مادے کی ہیئت اور اس کے تغیر و تبدل کے پیچھے کارفرما وجوہات تک رسائی حاصل کر گیا،

چنانچہ اب اس کے لیے یہ کائنات اور زندگی پراسرار نہیں رہی تھی کہ اسے سمجھنے کے لیے مفروضوں یا مابعد الطبیعات کا سہارا لینا پڑے۔ یا قدیم توہمات کے شکنجے میں پھنسا رہے، اس کا سایہ ادب پر بھی پڑنا تھا، چنانچہ عصر حاضر کے شعور کی نمائندگی کرتے ہوئے (Prometheus Unbound) کے پہلے ایکٹ میں خدائے بزرگ جو پیٹر (زیوس کا رومی متبادل) کے کہنے پر پرومیتھیس اذیت سہہ رہا ہے۔ اس گناہ پر کہ وہ انسانیت کو آزادی کا تحفہ دے چکا ہے۔ پرومیتھیس جو پیٹر کی ملامت کو یاد کرتا ہے۔ دوسرے ایکٹ کا آغاز آسیہ (حوا کی علامت) سے ہوتا ہے۔ جو سزا کے وقت سے پرومیتھیس سے بچھڑ چکی ہے، موسم بہار کی پہلی صبح کا وقت ہے، یہاں ایک پراسرار کردار (Demogorgon) سامنے آتا ہے۔ جو پیٹر کا تختہ اُلٹ دیتا ہے، نقادوں نے اس کو فطرت میں ہونے والے پروسس Process سے تعبیر کیا ہے، کائنات میں سب نظر آنے والے مظاہر کسی نہ کسی پروسس کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے تمام اُتھل پتھل اور تغیرات جنم لیتے ہیں اور یہی عمل انسانی ذہن کے لیے ہمیشہ ایک اسراریت اور جستجو کا باعث رہتا ہے۔

Demogorgon (جسے وقت، تاریخ اور عمل بھی کہہ سکتے ہیں) ناقابل مزاحمت، پیچ دار، کٹھور، بے نیاز ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اسے خود بھی پتا نہیں کہ اسے کون کنٹرول کر رہا ہے۔ آسیہ اس سے پوچھتی ہے یہ خیر و شر کیوں پیدا ہوئے۔ اس کے جواب میں وہ کہتا ہے، صداقت کی گہرائی میں جایا جائے تو کوئی صورت قائم نہیں رہتی (The deep truth is Imageless) لیکن ایک بات پکی ہے کہ پرومیتھیس کے اُٹھنے کا وقت آ گیا ہے۔ ادھر تیسرے ایکٹ کے آغاز میں پیٹر اپنی حمد و ثنا میں یوں مصروف ہوتا ہے۔

REJOICE! HENCEFORTH I AM OMNIPOTENT

ALL ELSE HAD BEEN SUBDUED TO ME: ALONE

THE SOUL OF MAN, LIKE UNXTINGUISHED FIRE.

YET BURNS TOWARDS HEAVEN WITH FIERCE REPROACH, AND DOUBT,

AND LAMENTATION, AND RELUCTANT PRAYER,

HURLING UP INSURRECTION, WHICH MIGHT MAKE

OUR ANTIQUE EMPIRE INSECURE, THOUGH BUILT

ON ELDEST FAITH, HELL'S COEVAL, FEAR.

(میں ہی قادر مطلق ہوں

ہر چیز مرے سامنے سجدہ ریز ہو چکی ہے

سوائے انسانی روح کے جو نہ بجھ سکنے والی آگ کی مانند

آسمانوں کی طرف شک، تحقیر اور آہ وزاری سے اُٹھ رہی ہے

یہ دل سے عبادت نہ کرنے والا ایسی بغاوت اُچھال رہا ہے

جس سے اس دُنیا پر ہماری قدیم حکمرانی غیر محفوظ ہو گئی ہے

جو جہنم کے خوف سے تعمیر کی گئی تھی

یہ خوف اور ہم ایک ہی عمر کے ہیں!)

جو پیٹر کے خدشات یونہی نہ تھے DEMOGORGON کے ہاتھوں اس کی معزولی پر پرومیتھیس اسے معاف کر دیتا ہے۔ اور جو پیٹر تخت کو خالی چھوڑ کر اپنی اس غار میں واپس چلا جاتا ہے جہاں سے اپنے تخلیقی فنون کے ذریعے اس دنیا پر اپنا اثر ثبت کرتا ہے۔ انسانی سماج اور فطرت دونوں کی از سر نو تعمیر ہوتی ہے اور ان کے بیچ ایک نئی مفاہمت تشکیل پاتی ہے، چوتھے ایکٹ میں سب ارواح پر مسرت گیت گاتی ہیں جن میں انسانی شعور اور فطرت کی ہیئت نو کے خوشگوار اثرات بیان کیئے جاتے ہیں، زمین اور آسماں کے نئے رشتوں کا ذکر ہوتا ہے اور انسان کی خوبصورتی پر حمدیہ گیت گائے جاتے ہیں، انسانی، خدائی رعب، پوجا پاٹ، اور بادشاہ سے آزاد ہو کر اپنے تمام طبقاتی، قبائلی اور قومیتی بندھنوں کو بھی توڑ دیتا ہے اور اس کے پاس تہذیب، عدل اور عقل باقی رہ جاتی ہے وہ انسان جو باہمی تفرت اور تصادموں کی وجہ سے منقسم تھا وہ اب محبت اور اجتماعیت کے جذبے سے سرشار ہو کر انسانی وحدانیت میں گم ہو جائے گا۔

لاکھوں کا سچ!

لاکھوں کا سچ کے نام سے ایک پروگرام چلتا تھا۔ اس میں لوگوں کو دعوت دی جاتی، وہ اپنے قریبی عزیزوں اور احباب کے سامنے بیٹھ کر اپنی نجی زندگی کے بارے سوالات کے صرف اور صرف سچے جواب دیں گے، اگر جھوٹ بولیں گے یا سچائی کو چھپائیں گے تو سچائی کو جاننے والا مشینی نظام بتا دے گا اور اسے پروگرام سے آوٹ کر دیا جائیگا۔ یہ پروگرام ناظرین کے لئے بھی تجسس کا باعث ہوتا، انسان ویسے ہی دوسروں کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتا ہے اور وہ بھی پورا سچ۔ ادھر شرکت کرنے والے اپنی خود اعتمادی سے آتے کہ وہ اپنی زندگی کے بارے میں سچ بولنے کی جرات رکھتے ہیں۔ ان کے قریبی عزیز ماں، بہن، بھائی، بیوی، منگیتر بھی لاکھوں روپے کا انعام پانے جوش اور خوشی میں شریک ہوتے۔ جب شریک خاتون یا مرد اپنی زندگی کے بارے میں سچ بولنے لگتا۔ تو اس کی بیوی، بچے، ماں، باپ، بہن بھائی گرل یا بوائے فرینڈ، جوابوں کی تاب نہ لا سکتے اور وہی سٹیج پر لائیوان کے درمیان کشیدہ صورت حال پیدا ہو جاتی۔ رونا دھونا شروع ہو جاتا کہ اچھا ابھی تک ہم سے یہ چھپایا گیا تھا۔ تیری ایسی کی تیسی۔ جواب دینے والا مزید سچ کا متحمل نہ ہو پاتا۔ اکثر اس کی اپنی ہمت بھی ٹوٹ جاتی اور اس کے ساتھ جو لوگ خوشی سے آئے ہوتے۔ وہ اسے برا بھلا کہہ کر پروگرام سے اُٹھ کر جا رہے ہوتے۔ میزبان منہ دیکھتا رہ جاتا اور پروگرام کے اختتام کا اعلان کرتا اور اگلے پروگرام کے لئے کسی اور کو سچ بولنے کی ہمت کرنے کی دعوت دیتا۔ ہمارے خیال میں یہ پروگرام کئی گھر برباد اور رشتے ناطے تباہ کرنے کا موجب ہوا ہوگا۔ ہم اپنی گھر والی کے ساتھ اس پروگرام کو تجسس سے دیکھتے اور جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ گئے۔ یہ پروگرام اچھا نہیں ہے۔ یہ لوگوں کے رشتے ناطے توڑتا ہے اور ان کی ذاتی زندگیوں کے سکون کو برباد کرتا ہے۔ پورا سچ کہا جاتا ہے نہ سنا جا سکتا ہے۔ مکمل سچ برداشت نہیں کیا جا سکتا اور ضروری بھی نہیں ہے، پورا سچ ہر ایک کے آگے رکھا

جائے۔ چنانچہ اپنی اپنی زندگی کا کچھ سچ چھپا ہی رہنا چاہئے۔ ہمیں دوست احباب اور رشتوں ناطوں کی پرسنل لائف کے بارے میں بہت زیادہ کریدنا نہیں چاہئے۔ ہر انسان اپنی جگہ پر ایک کائنات ہوتا ہے، اس کے لاتعداد زاویے، پرتیں، جہتیں ہوتی ہیں۔ ہمیں انسانوں کو بہت زیادہ جواب دہ نہیں بنانا چاہئے، لیکن ہماری گھر والی اس استدلال سے مطمئن نہیں تھی۔ اسے بیان کردہ سچ کی بنیاد پر اپنا فیصلہ Judgment دینے سے دلچسپی تھی۔ کون صحیح ہے اور کون غلط۔ انسان کو دوسروں کا جج بننا بہت بھلا لگتا ہے۔ مزہ آتا ہے، کسی کو جب ہم غلط یا صحیح قرار دیتے ہیں۔ اپنا آپ بھول جاتا ہے کہ دوسرے بھی ہمارے جج ہو سکتے ہیں اور ہمیں اپنی معلومات اور اپنے معیار سے اچھا یا برا کہہ سکتے ہیں۔ اصل میں انسان کچھ اچھا ہوتا ہے اور کچھ برا، اور اسی میں ایک تناسب سا رکھ کر ہم نے سماجی زندگی کو ایک ترتیب دینا ہوتی ہے۔ کہیں ہم معاف کرتے ہیں، کہیں درگزر کرتے اور کہیں آنکھ بند کرتے ہیں۔ انسان کی ترقی یافتہ تہذیب نے بتایا ہے۔ do not be judgmental کبھی فتویٰ نہ دو، لیبل نہ لگاؤ، کسی کے بارے میں فوری رائے قائم نہ کرو، دوسروں کے بارے میں خود اپنی ذات کے اچھے برے کے معیاروں سے ہٹ کر دیکھنا چاہئے۔ حقیقت بڑی پیچیدہ اور لطیف چیز ہے۔ جو بھی ہے اسے خود اس کے حالات و واقعات میں رکھ کر ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ جسے معروضیت کہتے ہیں، ہم سچ کے بہت دعویدار بنتے ہیں، سچ کو بڑی اعلیٰ سطح پر رکھتے ہیں۔ سچ کے بارے میں بہت کریدنا چاہتے ہیں۔ پورا سچ تو خدا جیسی کوئی ذات ہوتی تو وہی دیکھ سکتی۔ ہم نہ اسے پورا دیکھ سکتے ہیں، نہ اس کی معروضیت کو سمجھ سکتے ہیں، نہ پورے سچ کو برداشت کر سکتے ہیں۔ ورنہ سچ سامنے آئے بغیر بھی وہی شخص ہوتا ہے، باپ، بیٹا، بیوی، بیٹی، دوست، اور ان رشتوں میں وقت بھی اچھا گزر رہا ہوتا ہے، لیکن جوں ہی اس کے بارے کسی نجی سچ کا انکشاف ہوا، تباہی مچ گئی۔

سچ بڑا رومانی لفظ ہے، لوگ سچ کے ساتھ کشش محسوس کرتے ہیں۔ سچ کے بارے تجسس رکھتے ہیں، اسے جاننا چاہتے ہیں۔ اسے پانا چاہتے ہیں، اس تک پہنچنا چاہتے ہیں، لیکن جس طرح اس کائنات کی اصل تضاد ہے، اسی طرح سچ کی اصل بھی تضاد ہے۔ کسی دانشمند نے پرانے وقتوں میں اسی لئے کہہ دیا، سچ کڑوا ہوتا ہے، لیکن ہر کوئی سچ کو میٹھا سمجھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہیں رہتی کوئی بھی سچ کی کڑواہٹ برداشت نہیں کر پاتا۔ اسی لئے

کچھ دھوکہ، کچھ جھوٹ، کچھ سراب زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ سچ کوئی ایسی چیز نہیں کہ اسے مطلق قدر قرار دے کر پوجا جائے۔ ہم سچ کے پجاری بن کر خود کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں۔ سچ کے سامنا کے لئے بڑی ہمت چاہئے۔ سچ آپ کا منہ توڑ سکتا ہے۔ سارا اور ہر طرح کا سچ جان کر تو زندہ ہی نہیں رہا جا سکتا۔ اسی لئے سچ کی اتنی زیادہ دہائی نہیں ڈالنی چاہئے۔ اس کے پجاری ہونے کے اتنے دعوے نہیں کرنے چاہئے، اگر ہر انسان سچ پر چلنے لگے اور سچ کہنے لگے۔ یہ زندگی، دنیا، سماج قائم نہیں رہ سکے گا۔ زندگی کی بقا کے لئے اسے تھوڑا سا جھوٹ بھی چاہئے۔

اسی لئے بہت زیادہ نجی زندگی کے سچ کو نہیں کریدنا چاہئے۔ بہت زیادہ جزئیات میں نہیں جانا چاہئے۔ کچھ معاملات اور جزئیات آنکھوں سے اوجھل رہیں تو اچھا ہے، ورنہ ہر چیز اُلٹ پلٹ سکتی ہے۔ قطعی سچ کا سامنا بہت مشکل ہے۔ آپ ٹوٹ سکتے ہیں۔ سماجی معاملات میں ابھی انسان کا دماغ اور دل اتنا بڑا نہیں ہوا کہ وہ کسی دوسرے کے مکمل سچ کا سامنا کر سکے، اگرچہ کائنات میں کوئی شے مکمل اور مطلق نہیں ہے۔ سچ کے آگے اور اس کے پیچھے بھی بہت کچھ سچ ہوتا ہے۔ ہم تو سچ کا پہلا پرت ہی دیکھ کر دم توڑ سکتے ہیں۔ جب کہ سچ کے ہر پرت کے آگے ایک اور سچ کا پرت ہوتا ہے۔ سچ بھی متغیر و متحرک ہے۔ وہ ہر آن بدلنے والی چیز ہے۔ اس پر زمان و مکان کے لاتعداد اثرات مرتب ہو رہے ہوتے ہیں۔ جن کا محدود اور موضوعی کیفیت میں سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ سچ کو صرف جان لینا ہی کافی نہیں، سچ کا عقلی تجزیہ کرنا اور اس کے پس وپیش حالات و واقعات کو جاننا بھی ضروری ہوتا ہے۔ سچ کو اسی وقت جانا جائے، جب اس طرح کی صلاحیت اور ہمت موجود ہو ورنہ واقعات اور رشتوں ناطوں کی فیس ویلیو تک ہی رہنا چاہئے۔ ہاں فیس ویلیو میں تبدیلی ہو جائے تو پھر کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔ سچ کے بارے میں سائنسی تجزیہ کرتے ہوئے اہل دانش نے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ سچ کی ایک تعریف ہے، چیزیں کیسی ہیں how things are اور دوسری ہے، چیزیں کیسی ہونی چاہئے۔ پھر زمینی حالات actural conditons ہیں اور مثالی حالات ideal conditions کیا ہیں۔ کوئی فلاسفر ایسا نہیں گزرا، جس نے سیدھی سادی متفقہ سچائی کی تعریف پیش کی ہو۔ ہر ایک کا سچائی کا معیار الگ ہو سکتا ہے۔ سماجی تعلقات میں ہر ایک کی پرائیویسی کا احترام ہونا چاہئے۔ ہم سب رشتوں ناطوں میں منسلک اور جڑے ہونے کے باوجود اپنی ایک پرائیویسی رکھتے ہیں۔ جسے کسی رشتے کے حق کے نام پر نہیں توڑنا چاہئے اور نہ

جزئیات اور گہرائی میں جانا چاہئے۔ جب تک وہ بالکل سامنے نہ آجائے اور وہ آپ کے لئے ضرر کا باعث ثابت نہ ہو جائے۔ کسی کے کام کی کوالٹی کو توجج کر سکتے ہیں، لیکن کسی کے ذاتی فعل، خیالات اور اقدار کو جج نہیں کر سکتے، جب تک وہ آپ کو براہ راست نقصان پہنچانے کا باعث نہ ہوں۔ ہم سچ اور حقیقت کو دیکھ سکتے نہ برداشت کر سکتے، اگر وہ ہمارے نظریئے، معیار اور مفاد سے مختلف ہے۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے، یہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ چیزوں کو اپنی سہولت Convenience کے مطابق دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وہ مناظر کو اپنے لئے خوش کن بنانے کے لئے چیزوں کو خوش شکل goody goody دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اس میں ذرا سی تبدیلی یا کسی اور گوشے کا دخل اس کا مزہ کرکرا کر دیتا ہے

کہا گیا کہ فیصلے کا حق (Judgment) صرف خدا کو ہے، کیونکہ وہ سارے اور مکمل سچ کو جانتا ہے۔ یہ بات یہاں تک تو ٹھیک تھی، لیکن عملی طور پر ایمان والے نے خود سے ہی خدا کا نائب بن کر ٹھیکہ لے لیا، اگر خدا تک معاملہ رکھا جاتا تو اتنا برا نہ تھا۔ کسی کے مائنڈ کے اندر کیا ہے، اسے آپ کیسے جان سکتے ہیں، کوئی مائنڈ میں کیا کچھ نہیں کر لیتا، پھر اس کے بارے کیا ہوگا۔ کسی کے دماغ اور دل کے اندر جا کر کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ سچ کی اخلاقی، سماجی اور بین الذات پرتیں ہوتی ہیں۔ اوشو اس سلسلے میں پھول کی مثال دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آپ جب پھول کو دیکھتے ہیں تو آپ اس کی ظاہری شکل وصورت، رنگ وخوشبو سے متاثر ہوتے ہیں، لیکن اگر پھول کی سچائی جاننے پر بضد ہو جائیں اور پھول کا آپریشن شروع کر دیں، اس کا یہ رنگ کیوں ہے، اس کی خوشبو کہاں سے نکل رہی ہے وغیرہ اور آپ پھول کو ادھیڑ کر رکھ دیں تو پتا نہیں آپ پھول کی سچائی تک پہنچ پائیں یا نہیں، البتہ پھول نام کی چیز ضرور غائب ہو چکی ہوگی۔

جمالیات اور مذہبی عقائد

جمالیات کیا ہے، جمالیات کا اس کائنات اور بالخصوص انسانی زندگی میں کیا کردار ہے، ہماری مذہبی متھ میں جمالیات کی تمام شکلوں سے بیر کیوں ہے؟ صدیوں سے اس مقدس بیر سے ہمارا تہذیبی حلیہ کس حد تک متاثر ہوا ہے؟ علم بشریات تو کہتی ہے، جمالیاتی کام (Artistic Work) اتنا ہی پرانا ہے جتنا انسان اور یہ سلسلہ قبل از تاریخ سے لے کر عصرِ حاضر تک جاری وساری ہے۔ انسان کو دوسری ذی حیات سے ممتاز کرنے والی خصوصیت، فنونِ لطیفہ اور آرٹ سے اپنی ذات اور روح کی آزادی کا اظہار، متنوع اشکال اور نوع بہ نوع حالتوں کی اَبدی جستجو (Pursuite of Diversity) کے سفر پر نکل جانے کی اُمنگ رنگوں، سروں اور شکلوں اور زاویوں سے کھلنے کی آرزو۔ انہیں حسن و جمال کے بت نئے معنی خیز پیکروں میں بدل دینے کی کوشش۔

مذہب واحدنیت، مرکزیت اور قطعیت کا مطالبہ کرتا ہے، اس کے برعکس آرٹ تنوع (Diversity) کا، مذہب میں ماورائی طاقت خالق ہونے کی دعوٰی دار ہے جب کہ آرٹ بذاتِ خود تخلیقی جبلت (Creative Impulse) کا شاہکار۔ آرٹسٹ بنایا نہیں جاسکتا، اس کی تاروپود اور کیمسٹری کچھ یوں کہ اس نے کچھ خیال چُن دینے ہوتے ہیں، کچھ بول کہہ دینے ہوتے ہیں، کوئی تصویر یا صورت بنا دینی ہوتی ہے، کوئی رنگ بھر دینا ہوتا ہے، کوئی سُر نکال لینا ہوتا ہے۔ تخلیق کار کو پتہ نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کیوں اور کیسے کر رہا ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے۔ وہ تخلیق کی آخری شکل نہیں ہوتی، بلکہ ہر چیز ہر وقت تخلیق کے عمل سے گزر رہی ہوتی ہے۔ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے انسان اپنی اندر کی دنیا بھی بدلتا ہے اور گردوپیش کی بھی، ہر آن نئے خواب پیدا کرتا ہے، ان میں نئے معنی بھرتا ہے۔ اس کی نظریں ذروں کو چیر اور خلاؤں کو پھلانگ رہی ہیں خوب سے خوب تر کی ابدی تلاش میں بتلائے جنون ہے،، مرکزیت پسند مذہبی آئیڈیالوجی کو یہ آوارگی ناپسند ہے،

تخلیقی سفر میں شر اور گستاخیوں کے کئی درجے راہ میں آتے ہیں۔

آرٹ انسانی ذات اور روح کی آزادی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ غلام ہستی آرٹ نہیں پیدا کرتی، اس کے لئے آزاد منش روح چاہیے۔ یہ جیسی ہے، جہاں ہے کو تسلیم نہیں کرتی۔ انجماد (Fixation) قبول نہیں۔ وہ ظاہری شکلوں کو کسی اور طرح ہی دیکھنا چاہتی ہے، اسے کچھ اور ہی معنی دینا چاہتی ہے۔ اس میں کچھ اور ہی زاویے پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اسے کسی اور ہی سطح پر رکھنا چاہتی ہے۔ وہ تخیل (Imagination) کے وسیع و عریض سمندر میں بلاخوف وخطر، بلا روک ٹوک تیرنا پھرنا چاہتی ہے۔ مذہب اور حریت فکر متضاد قطبین ہیں۔ مذہب کے دربار میں آزادی نہیں غلام ہونا اعلیٰ درجے پر فائز۔ اسی لئے ہماری بستی کی دیواریں 'غلام ہیں، غلام ہیں' کے فخریہ نعروں سے یونہی تو بھری نہیں۔ جانور اپنے جھکے سر اور زمین سے ہاتھ اٹھا اکڑوں کھڑا ہوا تو انسان کہلایا تھا۔

فنونِ لطیفہ اور حسن پرستی سے اعتدال، نیکی اور اخلاق (Ethics and Virtues) کی راہ پھوٹتی ہے۔ آپ خوبصورت خواب دیکھتے ہیں، آپ خوبصورت چیزیں بناتے ہیں، آپ خود بھی خوبصورت بنتے ہیں، گردوپیش کو بھی خوبصورت بنا دیکھنا چاہتے ہیں، آپ خود خوبصورت کے اعلیٰ تر معیار قائم کرتے چلے جاتے ہیں اوروں کو بھی خوبصورت ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ آرٹ انسان کو نرم خو کرتا ہے، جس کی روح خوبصورت ہو، جو خوبصورتی کا شیدائی ہو۔ وہ ظلم پسند نہیں ہوسکتا، وہ ظلم کر نہیں کرسکتا، وہ انصاف اور اعتدال چاہے گا، وہ دوسروں کو بھی اپنے جیسا حق دے گا۔ اس کے برعکس اندر باہر کی تمام غلاظتیں وہی ٹھہریں، صفائی جہاں نصف ایمان نیکی اور اخلاق اگر خود تخلیق کئے جائیں، اپنے تجربے سے وہ باہر آئیں تو اپنی روح کا حصہ، اگر نیکی و اخلاق کا بنڈل آسمان سے اُتارا جائے تو یہی حشر۔ اوپر سے اوڑھے غلافوں میں نیک سیرتی نہیں منافقت کی آماجگاہ ہی ہوسکتی تھی۔ اہل مغرب نے اپنی نیکیاں خود بنائی ہیں، وہ عمل پیرا بھی ہیں، خود کار طریقے سے معاشرہ ریاست کے ساتھ، ریاست شہریوں کے ساتھ، لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہر آن نیکی کرتے، اخلاق سے پیش آتے، باہمی معاونت کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ''Sorry'' اور ''Thank You'' سے فضا میں رَس گھلتا رہتا ہے اور انسان کے باہم دوستی کا غیر محسوس رشتہ تشکیل پاتا رہتا ہے۔

حسن کشش رکھتا ہے، اپنی طرف کھینچتا، محو کرتا ہے۔ اپنی طرف دیکھنے، اپنے پاس بٹھانے پر مائل کرتا ہے۔ یہ منتقم اور حاسد مزاج خدا کو گوارا نہیں، اگر انسان سے اس کی تخلیق جبلت چھین لی جائے، اس کی جستجو کا بٹن آف کر دیا جائے، اسے رنگوں، سروں اور تصویروں سے کھیلنے سے محروم کر دیا جائے، رقص و سرور اور خوشی و مسرت کی لمحاتی مستی حرام کر دی جائے۔ انسانی کائنات میں رنگ بھرنے والا انسائی وجود اور بدن تصویر گناہ بن جائے، تب اس پر سیاہی کے چھینٹے پھینک کر تقوے کو بچانا ضروری ہو جاتا ہے۔ سوال، اختلاف اور تنقید کو جب سزائے موت دے دی جائے، کھوج حرام، ایسی ذہنی دنیا میں بن جائے جہاں سوال نہیں، صرف جواب ہی جواب ہوں، بنے بنائے تیار شدہ باریش جواب، آسمان سے اترے ناقابل تغیر جوابات اور پھر ان کی متضاد تعبیرات اور تشریحات کا ایک لامتناہی سلسلہ جو رہی سہی ہوش بھی گنوا دے نہ کچھ سمجھ آئے نہ ہاتھ!

انسان کا سفر حیوانیت سے انسانیت (خود اپنا بنایا تہذیبی و ثقافتی سفر) کی طرف بڑھ رہا ہے، جس میں حریت فکر اور جمالیاتی ذوق نے بنیادی طاقتور انجن کے طور پر کام کیا ہے۔ کیا کسی متھ کے چرنوں پر حریت فکر اور جمالیاتی ذوق کو تج کر انسان اپنا تہذیبی و ثقافتی انسانی سفر قائم رکھ سکتا ہے؟ کیا مذہب زندگی پر موت کو ترجیح نہیں دیتا؟ کیا مذہب آج پر کل کو اولین قرار نہیں دیتا؟ کیا مذہب زمین پر آسمان کو اولیت نہیں دیتا؟ کیا مذہب آرٹ پر رسوم (Rituals) کو ترجیح نہیں دیتا، روایات کو عقلیات پر۔ آج زندگی پر موت کو بخوشی ترجیح دیئے جانے کے مناظر ہم جو دیکھتے ہیں۔ جوان سال لڑکے مقدس کلمات کے ساتھ دوسرے انسانوں کو تیز دھار آلے سے ذبح کر رہے ہیں یا خود کو بارود سے لپیٹ کر موت کے حوالے کرنا بعد از موت (زندگی!) کے لئے۔ مذہب حیات کی اس حد تک نفی اور اسے اس حد تک بے قدر کرتی ہے اور اس خطرناک نقطے تک پہنچا دیتی ہے، جہاں زندگی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں اس کا خوفناک طریقے سے خاتمہ ہوتا ہے۔ یہ اس سفر کی انتہا ہے، جو صحرا میں صدیوں پہلے زندگی کے حسن سے آشنا کرنے والے فنون اور فطرت کی عطا کردہ لذتیں خود پر حرام کر دینے سے ہوا تھا۔ تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی سب علامتوں کو مٹا دینے پر تیار۔ آج انسانی علم خود انسان کو اور اس کے سفر کو سمجھنے کا ذریعہ ہیں۔ آخری تجزیے میں انسان خود ہی سب متھوں کا مصنف تھا اور ایک کے بعد دوسری کو تخلیق کر کے پہلی کو چھوڑتا رہا۔ یہ اس کے ذہنی بچپنے کا ایک مشکل اور طویل سفر تھا، جس سے وہ بالآخر اپنی ذہنی بلوغت کے ساتھ

آزاد ہو گیا۔ زندگی تو اپنا فلسفہ آپ تھی، اپنی تعبیر آپ، اپنا سفر آپ، اپنی راہنما آپ، یہ خود ہی خود کو معین Define کر سکتی ہے۔ یہ اپنے رستے خود ہی بناتی ہے۔ یہ اپنے اندھیرے اور اُجالوں کا خود ہی تجزیہ کر سکتی ہے۔ سب آنکھیں اس کے اندر ہی لگی ہیں، سارے مفہوم اس کے اندر ہی ہیں۔ ہم نے خود ہی ٹٹولنا ہے، خود ہی کھنگالنا ہے۔ زندگی اور کائنات کا عمل یک رنگا نہیں، ست رنگا ہے۔ یہاں سب کچھ تنوع Diversity سے عبارت ہے۔ اسے کسی ایک نقطے پر مرکوز کرنا، ہونے کی نفی ہے۔ ایک رُخ کو امامت نہیں بخشی جا سکتی زندگی، کائنات کے بے حساب روپ ہیں بے حساب زاویے بے حساب درجے۔

علم کو، آرٹ کو، رقص کو، اداکاری کو، مجسمہ سازی کو، شاعری کو، مصوری کو، ڈرامے کو، سینما کو، سازوں کو، رنگوں کو، موج کو، مستی کو، تفریح کو، ہنسی کو، کھیل کو انسانی زندگی سے نکال دیا جائے تو کیا وہ چوسے ہوئے آم کی طرح نہ ہو جائے گا زندگی کے رَس سے محروم ایک انبوہ کثیر کتنی غارت گری کا سبب بن سکتا ہے۔ موت زندگی پر، جہالت اور جذبات عقل پر، خیالی سچائی سامنے کی ٹھوس صداقت پر، روایت تحقیق پر، ماورائیت مادے پر غالب ہو رہی ہے۔

انسان نے کبھی شکست نہیں کھائی، زندگی نے کبھی ہار نہیں مانی۔ اس نے آگ اور خون کے دریا پار کئے ہیں۔ اعتدال، انصاف، حسن سے محبت، رواداری اور کثرتیت Pluralism پھر جیتے گی موت کے فلسفے اور موت کے سامان تلف ہوں گے۔ خواہ وہ کسی طرف سے بھی اٹھیں۔ زندگی اور زندہ رہنے کی اقدار جیتیں گی۔ زندگی کی خوبصورتی عام ہوں گی جنت اس زمین میں بنانی اور بسانی ہے۔

یہ دانش وری

(اوشو کے افکار سے متاثر)

کسی بھی معاشرے کو کچھ نہ کچھ مسائل ہر وقت درپیش رہتے ہیں۔ چنانچہ ہر معاشرے میں کچھ علماء، مفکر، اسکالر، ماہرین اور دانشور ہوتے ہیں جو فکری راہنمائی اور مسائل کا حل ڈھونڈنے میں مدد کرتے ہیں، لیکن دانشوری کا یہ ادارہ اب تنقید کی زد میں آنے لگا ہے۔ ایک پہلو سے دیکھا گیا، کہ دنیا میں جو بڑے دانشور پیدا ہوئے ہیں وہ روزمرہ معاملات میں اپنے نظریات سے کس حد تک ہم آہنگ زندگی گزارتے تھے انگریزی کی ایک کتاب ''The Intellectuals'' انسانی تاریخ کے بڑے بڑے دانشوروں کی زندگی کو زیرِ بحث لاتے ہوئے اس لحاظ سے مایوس کن تصویر کھینچی ہے۔

آج ساری انسانیت جن مختلف فرقوں، مذاہب، قوموں اور گروہوں میں تقسیم ہے۔ ان مختلف اور متصادم نظریات کو پیدا کرنے اور پالنے والے بھی دانشور ہیں۔ کیا یہ لوگ واقعی اپنے ماحول اور انسانیت سے مخلص ہوتے ہیں۔ یا جو کچھ کہہ رہے ہوتے ہیں، وہ ان کی ایگو کا پرتو ہوتا ہے۔ یا رائج نظام اور مقتدر قوتوں کی بالآخر خدمت ہو رہی ہوتی ہے۔ کیا آج کے سائنسی اور گلوبلائزیشن کے دور میں فکری رہنمائی کے دیگر پیمانے مقرر کیے جاسکتے ہیں؟ کیا ایک دانشور اپنے ماحول اور عہد کے تعصبات سے پاک ہوتا ہے؟ اس کی اپنی مجبوریاں، مفادات اور ذاتی شوق کس حد تک اس کی فکر کو متاثر کرتے ہیں؟ کیا زمانے کے تقاضوں اور اس کی رفتار پر ان کی قرار واقعی معروضی نظر ہوتی ہے؟ پرانے وقتوں کے پروہتوں (ملاؤں) اور آج کے سیکولر زمانے کے دانشوروں میں کیا فرق ہے؟ کیا یہ واقعی تبدیلی اور انقلاب کے نقیب ہو سکتے ہیں؟ کیا یہ اپنے اپنے

ماحول کو واقعی کسی ایسی راہ پر لگا سکتے ہیں جو بالآخر ساری انسانیت کو ایک عالمگیر بہاؤ میں یکساں کردے؟ کیا دماغ میں محض معلومات کا ہجوم انسان کو درست فکری راستے پر ڈال سکتا ہے؟

آئیے دیکھتے ہیں، دانش کسے کہتے ہیں۔ کسی موضوع پر عمومی معیار سے کچھ زیادہ معلومات، تجربات اور مشاہدات جب ایک دماغ میں یکجا ہو جائیں۔ جنھیں عرف عام میں علم (Knowldege) کہتے ہیں۔ تب دماغی پراسس اور ترتیب سے دانش کی تخلیق ہوتی ہے۔ گویا دانش (Intellect) ایک ایسا مظہر (Phenomenon) ہے۔ جسے خود اپنے اندر کاشت کیا جاتا ہے۔ پہلے خارج سے کچھ معلومات لے کر دماغ میں اسٹور ہوتی ہیں۔ ہر معاشرہ ان معلومات کی فراہمی کے لیے مذہب، تعلیمی ادارے اور میڈیا کے دیگر ذرائع بناتا ہے۔ یہ معلومات دماغ میں پہنچ کر حافظے کا ایک ایسا نظام (Memory System) بناتی اور اس طرح پروگرامنگ کرتی ہے کہ آپ ان معلومات کو اپنے خیالات کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ معلومات کے ان ذرائع کو بنانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ رائج نظام کے اندر رہتے ہوئے اپنے معاشرے، قوم کے مفادات کی خدمت کی جاسکے۔ دانشوروں کے درمیان اختلاف بظاہر کتنا ہی شدید نظر آئے، وہ اپنی سرشت میں سطحی اور فروعی ہی رہتا ہے۔ اپنے اختلاف رائے سے اسٹیبلشمنٹ کو وہ مختلف آپشنز فراہم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہے ہوتے۔

دانشور کی ایک خاص پہچان یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ صرف ماضی اور مستقبل میں زندہ رہتے ہیں۔ ان کی ساری فکری اٹھان ماضی اور مستقبل کے مفروضوں پر رکھی ہوتی ہے۔ حال اور سامنے کی موجود ننگی حقیقتوں سے یہ ہمیشہ صرف نظر کرتے ہیں۔ جب کہ وجود صرف حال میں ہوتا ہے۔ ماضی اور مستقبل فقط خیال ہوتے ہیں۔ ماضی اور مستقبل کا کام ہے کہ انسان کو فقط خیالوں (Thinking) میں پھنسائے رکھے۔ فکر کی خصوصیات ہوتی ہے کہ وہ انسان کو احساسات سے دور کردیتی ہے۔ مفکر کو ماضی اور مستقبل اس قدر عزیز ہوتے ہیں کہ وہ سامنے کی حقیقتوں سے بے حس ہو جاتا ہے۔ اور بھول جاتا ہے کہ اس کے سینے میں بھی دل ہے۔ یا احساسات بھی کوئی چیز ہوتے ہیں، دانشور کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، وجود صرف لمحہ موجود کا نام ہوتا ہے۔ سو لمحہ موجود سے زیادہ اہم اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ دانشور کی سوچ کا ماخذ دماغ ہوتا ہے۔ دل اس کے لیے محض خون پمپ کرنے کا ایک آلہ۔ یہی وجہ ہے دانشور پر تشدد نظریات کی حمایت پر بہت جلد مائل ہو

جاتے ہیں۔ان کے کسی نظریات مقصد کی خاطر اگر لاکھوں لوگ خون میں لت پت ہو جائیں، تو کوئی خاص مسئلہ نہیں ہوتا۔آپ دیکھ سکتے ہیں، کہ دانشور اپنے نظریات کی خاطر کسی بھی طرح کے تشدد، تباہی اور بربادی کو بڑی آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔کورو اور پانڈو کی لڑائی میں کرشن چچا زاد بھائی کے قتل کرنے کے لیے دانشوروں کی یونیورسل دلیل دیتا ہے۔تم کون ہوتے ہو یہ سوچنے والے کہ قتل تم کر رہے ہو یہ قتل تو تاریخ کے پراسس میں ہو رہا ہے تمھارے چچازاد بھائی کا قتل تم نہیں، وقت کر رہا ہے حالات کر رہے ہیں اور اس کے نتیجے کا ذمہ دار خدا، وقت اور تاریخ ہے تم احساس گناہ میں مبتلا نہ ہو۔جاؤ اور اپنے چچازاد بھائی کا قتل کر دو! اسی فلسفہ کی بازگشت ہمیں ہر اس قتل و غارت گری کے بازار میں ملتی ہے جسے مذہب، قوم اور ملک کا کاز بتا کر انجام دیا جاتا ہے۔ اس غارت گری کو کوئی دھڑکتا دل برداشت نہیں کر سکتا۔

دماغ بے شک نہایت اعلیٰ چیز ہے۔لیکن یہ انسان کے کنٹرول میں ہونا چاہیے۔اس کا آقا نہیں۔ورنہ انسان مشین کی طرح بے حس ہو جائے گا۔دنیا میں سب سے زیادہ غارت گری اور استحصال ماضی کے حوالے سے کیا گیا یا مستقبل کے نام پر، اور اس کو فکری اور اخلاقی بنیادیں ہر سوسائٹی کے اپنے اپنے دانشور نے فراہم کیں۔دانشوروں کی ایجاد کردہ تجریدوں (Abstractions) نے انسانی تہذیب کو کن کن المیوں سے دو چار نہیں کیا۔جب مختلف نوع کا عقیدہ رکھنے والے ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔تو دونوں کا جواب ہوتا ہے کہ وہ یہ نیک کام خدا کے واسطے انجام دے رہے ہیں۔کوئی نہیں سوچتا، تجریدی اور خیالی تھیوریوں کے نام پر اپنی حقیقی دنیا کو برباد کیا جا رہا ہے اور حقیقی انسانوں کا قتل ہو رہا ہے۔دانشور لوگوں کو ہمیشہ تجریدی دنیا میں بسائے رکھتے ہیں اور انھیں سامنے کی موجود حقیقی دنیا سے دور رکھتے ہیں۔ اسی طرح ان کا ایجاد کردہ ایک خیال لفظ (Humanity) انسانیت ہے۔یہ انسانیت کے بہت دعویدار ہوتے ہیں۔انسانیت کوئی ایسی چیز نہیں، جس سے کسی کی ملاقات ہو سکے۔اسے دیکھا جا سکے چھوا جا سکے۔یہ انسانیت کے لیے اتنا کچھ کر رہے ہوتے ہیں کہ دنیا میں کسی انسان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔یہی وجہ ہے اصل چیز انسانیت نہیں، کسی بھی انسان کا بذات خود وجود ہے۔اسی طرح ایک اور تجرید جس کے نام پر انسانوں پر بے پناہ ظلم ڈھائے گئے، وہ لفظ قوم کی ہے۔قوم بھی سراسر خیالی چیز کا نام ہے۔ایک Totality کا نام جسے کوئی دیکھ نہیں سکتا۔حقیقی چیز فرد ہے۔کروڑوں افراد کی زندگیوں کو قوم کے نام پر لوٹ لیا جاتا

ہے۔انھیں کسی وقت بھی جنگ کی تباہ کاریوں میں جھونکا جا سکتا ہے۔ان کے مال و متاع کو کسی وقت بھی ریاست اور قوم جیسے تجریدی الفاظ استعمال کر کے ضبط کیا جا سکا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن کروڑوں لوگوں کو بربادی کی طرف دھکیلا جاتا ہے۔کیا وہ قوم نہیں ہوتے۔جس زمین کی پامالی کی جاتی ہے کیا وہ وطن نہیں ہوتی۔صرف ایک تجرید اور خیال چیز کے لیے لوگ اپنی حقیقی زندگی دے ڈالتے ہیں۔یہ کیسی تہذیب ہے، جو سامنے ہے اس کی نفی ہے اور جو محض خیال ہے اس کی حکمرانی ہے اور یہی معاملہ لفظ خدا کے ساتھ ہے، (God) کی نہیں Godliness کی ضرورت ہے۔ Humanity کی نہیں Humantiness کی ضرورت ہے۔اگر ہمیں وجود اور زندگی سے دلچسپی ہے، تو ہمیں دانشوروں کی تجریدوں سے باہر حقیقی لفظوں کی دنیا میں آنا ہوگا۔دانشوروں کے پاس فقط ویژن ہوتا ہے لیکن وہ خود حقیقت سے کوسوں دور ہو سکتے ہیں۔اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اگر آپ کو کسی کی شاعری بہت روحانی، گہری اور دل کو چھو لینے والی لگی ہو تو اس شاعر کو ملنے مت چلے جایئے گا۔اسے دیکھ کر آپ کو بہت مایوسی ہو سکتی ہے۔وہ ایک معمولی انسان دکھائی دے گا۔ممکن ہے عام انسان سے بھی کم تر شاعر، بصیرت کے فقط چند لمحات ہی وارد ہوتے ہیں، جن میں وہ اونچی اُڑان اُڑتا ہے۔اس کے بعد بند اور آف ہو جاتا ہے۔اور پھر سے عام شخص بن جاتا ہے۔خوبصورت شاعری بجلی کی چمک کی طرح ایک لمحے کے لیے اس کے پاس آتی ہے لیکن شاعر خود اس روشنی کا باسی نہیں ہوتا۔صوفی شاعر کے لیے حسن ویژن یا تصور کی اُڑان نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا کلام حادثاتی اور ذہنی واردات ہوتا ہے حسن اس کا جیون ہوتا ہے سچائی کے لیے صرف سوچ اور فکر ہی کافی نہیں، محسوس کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔دانشور صرف سوچتا ہے محسوس نہیں کرتا اس لیے سچائی، حسن اور دل کی دنیا سے دور ہو جاتا ہے۔دماغ ایگو کو اُبھارتا ہے انسان کو چھوٹا کرتا ہے، اسے زندگی کے عظیم تر دائرے سے کاٹ دیتا ہے۔جب کہ دل انسان کی ذات (Self) کو زندگی کے عظیم تر وجود کے اندر Dissolve (تحلیل) کرتا ہے اور جس کے بعد خدا کا کوئی نام نہیں رہتا اور نہ ہی کسی کے وطن، قبیلے اور ذات کا تعصب باقی رہتا ہے۔

ذہانت دانش سے بالکل برعکس چیز ہے۔یہ خارج سے حاصل نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اسے فراہم کرنا کسی سکول، کالج اور یونیورسٹی کے بس کی بات ہے۔ہر بچہ پیدائش کے وقت ذہانت ساتھ لے کر آتا ہے۔ماحول کا تہذیبی عمل جوں جوں ذہانت پر اپنی زبان، الفاظ، نظریات اور

معیارات کی چھاپ پرنٹ کرتا ہے۔انسانی بچے کی ذہانت کا رشتہ اپنے حقیقی وسیلے سے کٹ جاتا ہے۔خاندانی، قبائلی، علاقائی، مذہبی اور قومی تعصبات کے جمع ہونے کے بعد اس کی فطرت سے عصومیت، پاکیزگی اور ذہانت رخصت ہوجاتی ہے۔یہ انسانی تہذیب کا افسوس ناک پہلو ہے۔

ذہانت اور دانش میں ایک اور فرق ہے۔ ذہانت مخلص، معصوم، رسیلی اور حس مزاح کے ساتھ رچی ہوتی ہے۔دوسری طرف دانش سنجیدہ اور خشک ہوتی ہے۔شاید ہی دانشور کو پبلک میں قہقہہ مارتے کسی نے دیکھا ہو دانش خود ساختہ Man Made عمل ہے، چونکہ دانش Original (اصلی) نہیں، مصنوعی ہوتی ہے۔ جسے ہر دانشور نے اپنے اصلی چہرے پر چڑھا رکھا ہوتا ہے۔وہ لاشعوری طور پر اس خوف میں رہتا ہے کہ لوگ اس کے اصل چہرے کو نہ دیکھ لیں۔اس لیے سنجیدگی طاری کر کے خود کو لوگوں سے دور رکھتا ہے۔سنجیدگی ماحول سے کاٹتی ہے۔لوگوں کے بیچ دیوار کھڑی کرتی ہے۔دانش انسان کو اکیلا ہی نہیں کرتی، ذہانت کو کند بھی کرتی ہے۔جب کسی کے پاس پہلے سے ہی مفروضیوں، جنھیں وہ نہایت افضل سمجھتا ہو تو ذہانت میں کمی ہوجاتی ہے۔ چنانچہ مدبرین اپنے مردہ اذہان کو معلومات، کتابوں اور لفظوں سے زیادہ سے زیادہ سجاتے ہیں۔ ہر دانشور تنقید سے خوف زدہ رہتا ہے۔دانش بند (Closed) ہونے کی وجہ سے تنقید کی ضرب نہیں سہہ سکتی۔ جب کہ ذہانت غیر جانبدار، زندہ، کھلی اور برجستہ ہوتی ہے، وہ اپنے پر حملے اور ضرب سے نہیں ڈرتی۔وہ ماحول کے خوف کے بغیر اپنی بات کہہ سکتی ہے۔دماغ انسان کو سمجھوتے کی طرف مائل کرتا ہے۔اس لیے کہ دماغ کا کام ذات کا تحفظ کرنا ہے۔ جونہی انسان نتائج کے بارے میں سوچتا ہے۔نتائج اس کی حفاظت شروع کر دیتے ہیں اور فراریت کے کئی راستے نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔یہ اور وہ ہوجائے گا کے چکر میں انسان بزدل ہوجاتا ہے۔نتائج کی پرواہ کے بغیر سوچنا معصومیت ہے۔ بلاشبہ اس میں غلطی اور خراب ہونے کا امکان ہو سکتے ہیں۔لیکن سچ کی تلاش میں غلطیاں اور خطائیں ہوں گی۔خراب ہو کر پتہ چلے گا کہ خراب کیونکر نہیں ہونا۔غلطی کو جان لینا سچ کے قریب ہونا ہوتا ہے، غلطی کو جان لینا سچ کے قریب ہونا ہوتا ہے۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ سچ کی کھوج کا سفر ہر شخص کو انفرادی طور پر خود طے کرنا چاہیے۔اسے دوسروں کے نتائج پر بھروسہ کر کے نہیں چلنا چاہیے۔اندھوں کی قطار نہیں بنانی چاہیے۔ہر شخص خود فیصلہ کرے سچ کیا ہے۔اسے کسی کی بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔

ہر انسان کی ذہنی عمر اس کی پیدائش سے چودہ سال کے بعد رک جاتی ہے۔فطری لحاظ سے اس عمر پر حیات کا اپنا مقصد پورا ہوجاتا ہے۔انسان ہونے کے ناطے اس عمل کو بدلا جاسکتا ہے۔اور بدلنا بھی چاہیے لیکن اس عمر کے بعد ذہن کی نشوونما اسی وقت ہوسکتی ہے، جب مقاصد جبلی ضرورتوں سے ماورا ہوں۔اگر مقصد کھانا کھانے، بچے پیدا کرنے اور خاندان تک محدود ہے تو پھر بیالوجی کی دی ہوئی ذہانت سے زیادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔اگر آپ کے مقصد وہ ہیں جو آئین اسٹائین کے تھے تو پھر ذہانت جسمانی عمر سے زیادہ ہونی چاہیے۔ذہانت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ آپ اس کے ساتھ کر کیا رہے ہیں۔اس طرح ذہانت کی نشوونما زندگی کے آخری سانس تک جاری رہ سکتی ہے۔حتیٰ کہ موت کے بعد بھی آپ کی ذہانت زندہ رہتی ہے۔اور بڑھتی رہتی ہے، آپ مرتے بھی نہیں، صرف آپ کا جسم مرتا ہے، ذہانت کا ویسے بھی جسم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ذہانت آگہی کے وصف کا نام ہے۔جتنی آگہی (Awareness) زیادہ ہوگی، اتنی ذہانت زیادہ ہوگی۔اگر مکمل آگہی رکھتے ہیں، تو آپ بھی اتنے ہی ذہین ہوجائیں گے، جتنی یہ کائنات اور یہ سارا وجود (Existenc) ذہین ہے۔ذہانت نام ہے، وجود کے کھل جانے کا، تعصب کے بغیر دیکھنے کی صلاحیت کا، مداخلت کے بغیر سننے کا، چیزوں کا ایک ساتھ رکھ کر پہلے سے اخذ کردہ نتائج کے بغیر دیکھنے کا۔چنانچہ ذہانت، انٹیلیکٹ سے قطعی مختلف ہے۔انٹیلکچول اپنے ساتھ مسلسل تعصبات، معلومات، عقائد اور علم رکھتا ہے۔وہ سن نہیں سکتا ہے، وہ پہلے سے ہی کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہوتا ہے۔اس کے سامنے جو بھی بات ہوتی ہے، وہ اس کے دماغ کے اندر بہت سے خیالوں سے گزر کر کچھ کی کچھ ہوجاتی ہے۔لہٰذا دانش بند، اندھی، بہری اور اس کے حامل کا دماغ تحریفات کا کارخانہ ہوتا ہے۔

ذہانت اور دانش میں ایک اور فرق ہے۔ذہانت ماضی کی دشمن ہوتی ہے، وہ ماضی کو ہر قدم پر مارتی ہے۔تازگی اور معصومیت میں رہنے سے ہی اس کا وجود ہے۔منجمد ہونا احمق ہونا ہے۔اگر آپ نے اپنے نتائج فکسڈ کر لیے ہیں، اور دوسروں کی بات سننے کو تیار نہیں، تو اس کا مطلب ہے آپ کا ذہن سیال اور رواں نہیں رہا۔ذہانت دریا کی مانند رواں رہتی ہے۔وہ نئی چیزوں، نئے موسموں کو قبول کرتی ہے۔کورذہنی، منجمد، متسلسل اور معین ہوتی ہے۔فرد ہو یا قوم جو ایک ہی فکر کے ساتھ چمٹے رہیں وہ احمق ہوتے ہیں۔یہ کل بھی وہی تھے آج بھی وہی ہیں، اور کل بھی وہی ہوں گے۔حالانکہ کل کا کسی کو پتہ نہیں۔کل اپنے ساتھ نئے تجربات لاتا ہے، ہمیں نئے نتائج اخذ کرنے

پڑیں گے۔ گزرے کل کے ساتھ ثابت قدم نہیں رہا جا سکتا۔ دریا کل کسی صحرا سے گزر رہا تھا، آج وہ جنگل سے گزر رہا ہے۔ کل اسے کسی نئی زمین پر بہنا ہوگا۔ آنے والے کل میں بھی گزرے گا، کل پر اصرار کریں گے، تو جامد اور مردہ ہو جائیں گے۔ زندگی پراسس کا نام ہے نہ کہ غیر متحرک ہو جانے کا۔ انٹیلیکٹ کی شناخت بھی اسی لیے ہو جاتی ہے کہ وہ غیر متحرک ہوتی ہے۔ جب کہ ذہانت رواں ہونے کے سبب غیر شناخت شدہ رہتی ہے۔

ذہن (Mind) بہت اچھی چیز ہے اگر آپ اسے استعمال کرتے ہیں تو یہ آپ کی خدمت کرتی ہے لیکن اگر ذہن آپ کو استعمال کرنا شروع کر دے، تو یہ تباہ کن اور خطرناک ہے۔ ذہن ایک اندھی مشین ہے، اس کو جدھر لگاؤ لگ جائے گا۔ چنانچہ یہ آپ کو کسی نہ کسی مصیبت، تکلیف اور ذلت میں ڈال دے گا۔ اس کی آنکھیں نہیں، وہ دیکھ نہیں سکتا، اس کے اندر جو قید کیا ہوگا، اسے دہراتا رہے گا۔ تعلیم اس طرح کی فیڈنگ کا نام ہے، ایک یادداشت کا ڈھیر آپ کو جب کسی چیز کو یاد کرنے کی ضرورت پڑے، ذہن اسے فراہم کر دے۔ ذہن ہر بات کی دلیل پیدا کر لیتا ہے، ظلم کی اور جہالت کی بھی۔ ایک آزاد انسان آپ اسی وقت بن سکتے ہیں، جب ذہن آپ کو نہ چلائے، آپ خود ذہن کو چلا رہے ہوں۔ رفتار، سمت اور منزل کا تعین آپ خود کریں۔ کہاں شروع کرنا ہے، کہاں رکنا ہے، یہ سب فیصلے خود کریں۔ کار پر سے کنٹرول ختم ہو جائے تو پھر خاتمہ لازم ہے۔ معلومات اور علم بذاتِ خود خراب چیز نہیں۔ یہ اس وقت خطرناک ہوتے ہیں، جب آپ کو ان کی ضرورت نہیں، اور یہ آپ کے ذہن پر Hammering کرتے رہیں۔ جب آپ بہم معلومات کے شکار ہو جائیں اور یہ آپ کو اپنے مطابق کام کرنے پر مجبور کریں۔ معلومات مقصد نہیں، ذریعہ ہیں۔ اگر یہ اتنے طاقت ور ہو جائیں کہ ہر وقت دماغ میں چلتی رہیں، اور آپ ان کا بٹن آف نہ کر سکیں۔ تب دماغ تھک جاتا ہے۔ خستہ ہو جاتا ہے۔ اس کی قوت خارج ہو جاتی ہے۔ ساری انرجی ختم ہونے پر کون ذہین رہ سکتا ہے۔ ذہانت کو چھلکتی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مکمل صحت کی، اپنے پورے پن کی، ایک ذہین آدمی ہی اپنے دماغ کو معروضی اور موضوعی طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ وہ جتنی آسانی سے باہر کی طرف حرکت کرتا ہے، اس کے لیے اندر کی طرف حرکت بھی اتنی ہی آسانی ہوتی ہے۔ وہ سیال، رواں لچکدار اور مالا مال ہوتا ہے۔ اپنے آپ کا آپ آقا۔ اس پر کوئی حکمرانی نہیں کر سکتا۔ وہ کار کو آگے بھی لے جا سکتا ہے اور پیچھے بھی۔ اندر

ٹھنڈک ہو، تو باہر دھوپ سینکنے کے لیے نکل سکیں، اور جب باہر سخت گرمی ہو، تو آپ اندر آ سکیں۔ خود پر حرام اور حلال کے پیمانے فکس نہ کریں۔ زندگی کا تعلق روانی اور حرکت سے ہے۔ جونہی کسی جگہ فکس ہوئے آپ ایک بے جان شے بن جائیں گے۔

ماہرین کا مطلب یہ نہیں ہوتا، کہ وہ بہت زیادہ علم والے ہیں۔ بلکہ صورت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ جوں جوں ایک شخص کسی چیز میں بہت زیادہ مہارت (Specialisation) حاصل کر لیتا ہے۔ تو اصل میں اس کا علم کم سے کم تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا علم صرف ایک نقطے پر مرکوز ہو کر رہ جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ باقی دنیا اور وجود کے بارے میں اس کا علم کم سے کم تر ہو رہا ہے چنانچہ انسان کو اپنے اندر اور باہر کی سائنس اور روح کی دونوں ہی زبانیں جاننا ضروری ہے۔ خارجی دنیا کی بھی مکمل خبر ہو، اور اپنے اندر کی دنیا کی بھی ایک ایسی زبان پر عبور حاصل کرنا ہوگا، جو معروض کو موضوع کے ساتھ، مادے کو روح سے، اور مشرق کو مغرب کے ساتھ رکھ کر جوڑ سکے۔ ان کے درمیان پل بنا سکتے ہوں۔ تب ایک مکمل انسان وجود میں آئے گا۔ مکمل انسان گہری ذہانت سے ہی وجود میں آ سکتا ہے۔ ورنہ ایک طرف ریاستی جبر ہوگا، دانشوروں، سیاست دانوں اور حکمرانوں کی منافقت ہو گی۔ اور دوسری طرف بے حس ہجوم اور بے گانگی کا جم غفیر۔ ہمارے استاد، دانشور، ادیب، عالم دین کون ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو ہجوم کو خوش کرنے والی زبان بولتے ہیں۔ ان سب کے لیے اپنی سوسائٹی کے مزاج اور اس کی روایات و رسوم سے اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے۔ دیکھا جائے تو یہ سب لوگ مستعار زندگی جیتے ہیں ہجوم کی دی ہوئی زندگی! یہ ہجوم کو سامنے رکھ کر سوچتے ہیں۔ مستعار زندگی ہلکی پھلکی نہیں ہو سکتی۔ وہ بوجھل، خشک اور مردہ ہو گی۔ ایک آزاد اور باغی ہی اپنی زندگی جی سکتا ہے۔ اس میں برجستگی ہوتی ہے نہ کہ روایت پرست۔ ذہین آدمی اپنے ماحول کے دیئے عقائد کو من و عن قبول نہیں کرتا۔ عیسیٰ یہودی پیدا ہوا، یہودی نہ رہا بدھ ہندو پیدا ہوا، ہندو نہ رہا یہ ذہین آدمی کی پہچان ہوتی ہے۔ دانشور ایگو کا مارا ہوتا ہے۔ وہ بدل نہیں سکتا۔ اس معاشرے کی دانش ور کلاس اتنی ہی اندھی ہوتی ہے، جتنا اس معاشرے کے دیگر لوگ۔ وہ بھی اسی احمق وجود کا لازمی حصہ ہوتے ہیں، وہی زبان بولتے ہیں۔ جو ہجوم کے لیے قابل فہم ہو۔ ذہین آدمی کی زبان مختلف ہوتی ہے۔ وہ جب بولتا ہے، محسوس ہوتا ہے جیسے دوسری دنیا کا آدمی ہو!

روحانیت اور مادّیت کا رشتہ!

(اوشو کے خیالات سے متاثر ایک مضمون)

روحانیت اور مذہبیت کیا ہے، ان دونوں میں کوئی فرق ہے، آج کے دور میں جسے Age of Reasoning کہتے ہیں، وہاں زندگی اور کائنات کے بارے سائنسی حقائق سامنے آنے کے بعد یہ دونوں کہاں کھڑے ہیں۔

مذہبی میکانیات مخصوص عقائد، رسومات، تقدیسی شخصیات اور علامات کا مجموعہ ہوتا ہے، جن پر بے چوں وچرا ایمان لانا ہوتا ہے۔ ان کا عقلیات، معروضی حقائق یا تجزیے سے کوئی تعلق نہیں۔ ایمان پہلے لایا جاتا ہے اور سوال بعد میں اٹھایا جاتا ہے جس کا مطلب اور مقصد اپنے نظریاتی فریم میں موجود میکانیات کو جائز ثابت کر کے اپنے آپ کو خوش کرنا یا خود کو دوسروں پر فوقیت دینا ہوتا ہے۔ ہر ایک عقیدے کے ماننے والے اپنے اپنے عقائد پر خوش اور مطمئن ہیں کہ ان کا عقیدہ ہی اس دنیا کی آخری سچائی ہے! اور ان کی نجات اسی میں ہے۔ عقیدہ انسانی تہذیب میں اس وقت شروع ہوا، جب انسان اپنے شعور کی ابتدائی حالت سے گزر رہا تھا۔ وہ اس کی سادہ لوحی کا زمانہ تھا، اسے فطرت کی ناموافق زور آور قوتوں کا سامنا تھا اور وہ ان کے سامنے بے بس اور کمزور تھا۔ چنانچہ اسے نفسیاتی سہارے کی ضرورت تھی۔ مذہب نے انسان کا ایک اور نفسیاتی مسئلہ حل کیا۔ عملی زندگی کو درپیش مسائل اور چیلنجوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان کو سو طرح کی ناانصافیاں اور ظلم روا رکھنے پڑتے ہیں۔ عقیدوں سے انسان نے اپنے اس احساسِ گناہ سے بھی نجات حاصل کر لی۔ جرم کریں، گناہ کریں، ان سب کو دھونے کے لئے سو طرح کے حیلوں اور طریقوں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ انسان کو Guilty ہونے کے

احساس سے بھی نجات مل گئی، انسان کا Moral Question بھی حل ہو گیا۔ اسی طرح ساری عمر کے مجموعی گناہ بھی بالآخر کسی نہ کسی طریقے سے معاف ہو جائیں گے۔ گویا عملاً خدا انسان کے اپنے مفاد میں استعمال ہونے والی ہستی گیا۔ جو ماحول اور حالات کو انسان کے تابع مرضی کر سکنے میں اس کی مدد کرتا ہے۔ پھر مذہب نے انسان کا ایک اور نفسیاتی مسئلہ بھی حل کرنے میں مدد کی، وہ تھا موت۔ انسان بہرحال موت کو قبول نہیں کر سکا۔ یہ زندگی ختم ہو جائے گی، میں نہیں رہوں گا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد میری یہ سب مادی، جذباتی رشتے اور لگاؤ Attachments کیا بالآخر سب فنا ہو جائیں گے۔ کیا زندگی کو ابدی شکل نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ اس نے عقیدوں سے یہ بھی اپنا مسئلہ حل کروایا۔ اسے بعد از حیات ایک اور زندگی کسی نہ کسی شکل میں دینے کی ایک تصوراتی راہ نکالی چنانچہ روایتی مذہب نے انسان کے تین بے حد بڑے اور اہم کام کئے۔ فطرت کی قوتوں سے مقابلے کی سکت، گناہ کے احساس نجات اور موت کے خوف پر قابو، بقا کی جنگ میں انسان کا یہ ایک ٹریک تھا۔ انسان بیک وقت ایک دوسرے ٹریک پر بھی کام کر رہا تھا۔ وہ تھا تسخیر فطرت کی مادی سطح پر کوششیں اور فطرت کی قوتوں کے قوانین کو سمجھنے کا ذہنی عمل۔ یہ فلسفے، سائنس اور اوزار و ہتھیار بنانے کا عمل تھا اور آج اکیسویں صدی میں انسان اس مرحلے پر پہنچ چکا ہے کہ اسے پہلے ٹریک کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ فطرت کی قوتوں سے اب وہ مقابلہ انجینئرنگ کے ذریعے کر سکتا ہے۔ اسے اس کے لئے معجزوں، کرتبوں اور ہستیوں کی ضرورت نہیں رہی۔ زندگی اور موت کے سارے پراسس کو بھی وہ اچھی طرح سمجھ رہا ہے۔ انا کے مسائل بھی حل ہو رہے ہیں جو اس کائنات اور زندگی کے عمل کو سمجھنے میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ مورال ایشو بھی سماجی اور نفسیاتی علوم حل کر رہی ہیں۔ ان پر بھی یونیورسٹیوں میں بے بہا کام ہو رہا ہے۔ علم طب نے انسانی زندگی کی ناپائیداری کا مسئلہ بھی کافی حد تک حل کر لیا ہے اور ظاہر ہے ان تمام علوم میں نہ صرف مزید بہتری ہوتی چلی جائے گی، بلکہ انسان اپنے تمام طرح کے مادی، سماجی اور نفسیاتی مسائل پر بہتر سے بہتر علم اور کنٹرول حاصل کرتا جائے گا۔ اس کے لئے اب کسی مابعد الطبیعیاتی نظام کی ضرورت نہیں۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی ہے۔ مذاہب کی تخلیق اور تحقیق عمل تاریخ کے ایک لمحے میں خود انسان کی اپنی ایجاد ہیں۔ عقائد زیادہ تر اب صرف وہی ہیں، جہاں علمی اور معاشی ترقی ابھی نوزائیدہ ہے۔ عقائد نے کسی زمانے میں انسان پر بادشاہت کی ہے۔

اب یہ ملاؤں، پادریوں اور پنڈتوں کا روبار ہے جو سیاست دانوں کے بھی کام آتا ہے۔ عقائد کو ایک نعرے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب اپنے پسماندہ، کمزور، غریب اور کم علم عوام کو بے وقوف بنانا رہ گیا ہے جو درمیانہ اور تجارتی طبقہ عقیدوں پر عمل پیرا نظر آتا ہے، اس کا سراسر مقصد اپنے استحصالی اور لوٹ مار کے عمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساس گناہ کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے۔ انہیں موت کا خوف ہوتا ہے۔ وہ اپنی اکٹھی کی ہوئی دنیاوی دولت کی ملکیت کو عقیدوں کے ذریعے ابدی شکل دینا چاہتے ہیں، ہر ایمان رکھنے والا آدمی مادی دولت اور وسائل کے حصول میں اتنا ہی پاگل ہے، جتنا کوئی بھی دنیاوی آدمی ہوسکتا ہے۔

اب ہم آتے ہیں روحانیت کی طرف، مادہ اور روح کی بے حد پرانی لڑائی ابھی تک جاری ہے۔ اس پر کچھ کام صوفیا کرام نے کیا ہے۔ کچھ فلسفہ اور نفسیات دانوں نے اور کچھ اب کام علم طبیعات (فزکس) کی سطح پر بھی سامنے آرہا ہے۔ انسانی ذہن نے یہ ماننے سے انکار کیا ہے کہ وہ محض ایک اینٹ، پتھر کی طرح ہے۔ انسان کو یہ احساس رہا ہے کہ وہ اپنے جسمانی وجود اور جسمانی نظام کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ یہ سوالات اسے ستاتے ہیں، وہ کیا ہے، کیوں آیا ہے، کہاں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ جذبات، محسوسات، لگاؤ کا سارا کھیل کیا ہے۔ اصل میں ہم جس دنیا اور کائنات میں رہ رہے ہیں اور جس کا ہم لاینفک حصہ ہیں، وہ بے حد و حساب پیچیدہ ہے۔ سیال Fluid ہے، ایک ہی لمحے کی ایک ہی ذرے کی لاتعداد جہتیں ہیں۔ ہم ایک ہی لمحے میں سب جہتوں اور پرتوں کو ایک ہی وقت میں اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے۔ وہ ایک ہی وقت میں مختلف دنیاؤں میں رہتا ہے۔ اس کی ایک دنیا عقل سے متعلق ہے، دوسری نفسیاتی، تیسری جذباتی، چوتھی مفاداتی اور سماجی۔

ہم ایک وقت میں صرف ایک یا کچھ تھوڑی سی جہتیں ہی پکڑ سکتے ہیں، لیکن مسئلہ یہ بھی آتا ہے کہ ایک لمحہ، ایک ذرہ جو تھوڑی سی جہتیں کسی ایک لمحہ میں پکڑ رہا ہے، ساتھ والا لمحہ، ساتھ والا ذرہ میں اسی لمحے کسی اور جہتوں کی پکڑ میں ہے، پھر یہ بھی بات ہے جس وقت ہم لمحہ کہتے ہیں، لمحہ تو گزر بھی چکا ہوتا ہے۔ بات کیسے کریں؟ اور ایک مستحکم بات کا دعویٰ تو بلکہ ہی فضول ہو جاتا ہے۔ ایک بے حدود مسلسل عمل اور ردعمل، عمل کے عواقب کو ہم نہیں پکڑ سکتے۔ ہم اور ہماری توانائیاں زمانی اور مکانی حدود میں مقید ہیں، جب کہ ہمارا سامنا لامحدودیت Infinity کے ساتھ ہے۔ چنانچہ سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ہمیں کچھ حدود Parameters بنانے پڑتے ہیں ہر دم وجود میں آتے اور پیدا

ہوتے تضادات کی سائنس کو جاننا ہے اور انسان کے اس سفر کو بھی جو حقیقت میں ابھی شروع ہوا ہے، اس زمین کی عمر کو سامنے رکھتے ہوئے، انسان کو وجود میں آئے ابھی فقط چند منٹ ہی ہوئے ہیں، لیکن وہ کہاں کہاں سے گزر گیا ہے اور کیا کچھ حاصل کر گیا ہے۔ ہمارے لئے یہ حوصلہ افزا بات ہے کہ مزید وہ کیا کچھ نہیں کر جائے گا آنے والے وقت میں۔ ٹھیک ہے، عاشقی صبر طلب ہے اور تمنائیں بے تاب ہم پورا سچ فوری طور پر جان جانا چاہتے ہیں یا پورا سچ جان جانے کے دعویدار بن کر اپنی انا کو خدا کے سنگاسن پر بٹھا کر اپنے آپ کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ ہم پورا جیون ایک ہی لمحے میں جی جانا چاہتے ہیں۔ ہم بہت سہولت سے بھول جاتے ہیں کہ ہم نامکمل ہیں اور ہمیشہ نامکمل رہیں گے، اس لئے جو کل Whole ہے وہ الگ سے کوئی وجود نہیں، وہ انہی لامحدود ناقصات (Imperfections) کا مجموعہ ہے۔ اس کے خمیر میں نامکمل رہنا لکھا ہے۔ وہ محوِ حرکت ہے، ایک ازلی اور ابدی حرکت میں ہمیں حرکت میں ہی رہنا ہے۔ ہم حرکت میں ہی رہیں گے۔ اس سے کوئی فرار نہیں مطلق تعریف (Definition) کسی ساکت چیز ہی کی ممکن تھی۔ مطلقیت کا وہم ہمیں کٹر پن کی طرف لے جاتا ہے، اپنی انا کو سیال Fluid کرنا ہے۔ ہم کائنات کے بہاؤ میں ہیں، ہمارے آس پاس جو کچھ بھی ہے، بہاؤ میں ہے۔ زمان اور مکاں کے اسی بہاؤ میں تیرنے کو روحانیت کہا جاسکتا ہے۔ آج کے دور میں روحانیت کسی مابعد الطبیعاتی شعبدہ بازی کا نام نہیں۔ جبلتوں سے آگے انسان کی جو بھی سرگرمیاں ہیں وہ انسان کی ذات کا روحانی حصہ ہے۔ اس کا مابعد الطبیعات سے کوئی تعلق نہیں۔ طبیعیات سے ماوراء کچھ بھی نہیں، جو کچھ بھی ہے طبیعیات کے اندر ہے اور ایک طبیعیاتی عمل کی پیداوار ہے، اصل میں یہ مذہب تھا جس نے مادہ اور روحانیت میں دوئی پیدا کی اور ان دونوں کو متصادم صورت میں دیکھا جب کہ مادہ اور روح ایک ہی چیز ہیں۔ روح مادے کی ہی خصوصیت ہے، چنانچہ یہ دونوں کسی تصادم کے بغیر بلکہ بے حد ہم آہنگی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ انسان ایک روحانی وجود Spiritual Being ہے، لیکن اس کا ایک مادی جسم بھی ہے، ان میں کوئی تصادم نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھا جاسکتا کہ جسم کہاں ختم ہو رہا ہے اور روح کہاں شروع ہو رہی ہے۔ وہ تو کل Whole ہیں۔ روحانیت کے لفظ کو پیری فقیری سے پراگندگی منتقل ہوئی ہے حالانکہ یہ انسان کی لطیف حسیات ہیں، روحانیت اس آگہی (Awareness) اور احساس کا نام ہے کہ کائنات کے سارے کا سارا وجود ایک ہی سلسلے میں چل رہا ہے اور ہر جز و اس کائناتی

سلسلے میں ایک دوسرے سے منسلک اس کائناتی بہاؤ میں محوِ سفر ہے۔

سوچ، فکر، دُکھ، خوشی، امید، پیار، انتظار، حسن نشہ کیا ہے؟ انسان کو کیوں ضرورت پڑی کہ وہ ذہن Mind کے علاوہ ایک دل اپنے آپ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ایجاد کرے۔ حالانکہ جسم کے اندر جو دل نام کی گوشت اور خون سے بنی چیز ہے، اس کا اس دل سے کوئی تعلق نہیں جسے ہم روز مرہ محاورے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ روحانیت مادی انسان کا اور ہماری مادی دنیا کا وہ حصہ ہے، جو بے حد نرم ولطیف Subtle ہے، جیسے پھول مٹی سے ہی بنا ہوتا ہے، لیکن پھول کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مٹی کے سوا کچھ نہیں اور اگر ہم یہ ہر وقت کہنے پر مصر ہوں کہ پھول صرف مٹی ہے اور کچھ نہیں تو پھول کی ساری لطافت برباد ہو کر رہ جائے گی، حالانکہ اس کی صداقت سے کوئی انکار نہیں۔ یہی حال اس دنیا میں روحانیت کا ہے، یہ جو ہمارا وجود ہے اور ہم جس دنیا میں رہ رہیں سارے کا سارا مادی ہونے پر کوئی شبہ نہیں۔ اصل اور پہلے مادہ ہی ہے، روح مادے کی ثانوی خصوصیت ہے، اگر ہم انسانی وجود کے لطیف حصے کو روح اور روحانیت سے تعبیر کر لیں تو حرج نہیں۔ روح اور روحانیت میں عقیدوں نے جو مفہوم پیدا کر رکھا ہے، صرف اس سے پاک کرنا ہے، ورنہ روح اور روح کے الفاظ، خیال اور مفہوم اپنی جگہ انسانی وجود کا اہم جزو ہے جسے رَد نہیں کیا جاسکتا، جب تک زبان روح کے متبادل الفاظ ایجاد نہیں کرتی۔ جب ہم سارے انسانوں کے بارے میں اپنے ہونے کا احساس پاتے ہیں، جب یہ ساری زمین، تمام مخلوقات، آسمان، چاند تارے سب اپنے لگتے ہیں، سب پر پیار آنے لگتا ہے جب اپنی ایگو کی بجائے ہمیں دوسروں کا احساس ہوتا ہے۔ جزو اور کل کے ایک ہو جانے کا احساس۔ یہ سب انسان کے اندر روحانی حصے کی کرشمہ سازی ہے۔ طبیعیات کی ایک اپنی مابعد طبیعیات ہے، جس کا اوّل وآخر بہر حال مادہ ہے۔ مادہ ہے تو روح بھی ہے، مادہ نہیں تو روح بھی نہیں۔ توانائی کی وہ تمام اشکال جو مادے کے اندر پائی جاتی ہیں وہ انسان کے اندر محسوسات کی دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ سب احساسات، سب نازک خیالیاں، سب فسانہ گریاں اس وقت تک ہیں، جب انسان زندہ ہے۔ مادے کے زوال اور بکھراؤ کے بعد کچھ نہیں۔ سوائے اس میٹریل نے کچھ اور شکل اختیار کر لی۔ اب وہ جانے اور اس کا کام کہ وہ کن کن شکلوں میں منتقل Transform ہوتا ہے۔

روحانی ہونے کے لئے عقیدوں کی پیروی ضروری نہیں، بلکہ عقیدوں تک محدود آدمی روحانی

ہو نہیں سکتا۔ روحانی ہونے کے لئے لامحدود Infinite ہونا ضروری ہے۔ عقیدوں میں پھنسا آدمی اپنے عقیدے کے متعصب یکطرفہ تنگ دائروں سے نہیں نکل سکتا، نہ وہ کسی کو اپنے میں سمو سکتا، محبت بھی ایک روحانی عمل ہے۔ سمونا اور سمو جانا روحانیت اور محبت کے بنیادی فنکشن ہے۔

انسان کی ایک خارجی (Outer) سطح ہے اور ایک اس کی داخلی (Inner) سطح ہے۔ ہمارے ہاں میں یہ ہوا کہ خارجی سطح (مادی حصے) کی مذمت کی گئی اور اس کے صرف داخلی حصے کو اہمیت دی گئی۔ دنیا سے راہ فرار کیا، تا کہ وہ اپنے اندر کے سفر کی تکمیل کر سکیں۔ مغرب میں اس کے اُلٹ ہوا۔ انہوں نے اندر کی دنیا کو خیر باد کہہ دیا، تا کہ وہ ساری توانائی اپنی باہر کی دنیا کو تسخیر اور سنوارنے میں صرف کر سکیں۔ دونوں ہی آدھے رہ گئے۔ ایک حصہ بڑا ہو گیا اور دوسرا حصہ کچل کر رہ گیا۔ ہمارے ہاں اتنی غربت، بیماری، جہالت، اور ظلم ہے جس کا اندازہ نہیں، لیکن لوگ پھر بھی مطمئن پھرتے ہیں، ہر آن اللہ کا شکر بجا لاتے رہے۔ بغیر مزاحمت اور تبدیلی کی خواہش کے، صدیوں سے غربت، بیماری، غلامی اور موت کو قبول کر رکھا ہے اور سارا زور ایمان کے درست کرنے پر دیے رکھا ہے۔ مغرب نے بیماری اور غربت پر قابو پا لیا، انہوں نے انسان کے جسم اور اس کی بیرونی دنیا کو خوبصورت اور آرام دہ کر دیا، مگر انسان کا خود اپنا آپ غائب ہو کر مشین کی ہی توسیعی شکل اختیار کر گیا۔ باہر سب کچھ مگر اندر سے کہیں خالی پن کا احساس۔ اب تیسرا نظریہ آرہا ہے کہ انسان کی اندر اور باہر کی نشوونما مساوی طور پر ہو۔ روحانی آدمی اصل میں وہی ہو سکتا ہے جو مادی لحاظ سے خوشحال اور بھرپور زندگی گزارنے کے نظریئے پر چلتا ہو، کیونکہ وہی زندگی کی سطحیت کو سمجھ سکتا ہے اور روحانی ہو سکتا ہے۔ صرف مہاتما بدھ بننا، زندگی کا خاتمہ ہے اور صرف تعیش کی زندگی گزارنا، اپنے اندر کی گہرائی اور وسعت کا خاتمہ ہے، چنانچہ ایک روحانی گہرائی بھی ہونی چاہئے اور زندگی میں لہولعب کا رس بھی۔ اسے ہی انسانی اور کامل زندگی کہا جاسکتا ہے۔

انسان کی ذات ان دونوں جہتوں کے فروغ کے لئے میسر ہو۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اس دنیا کو بہتر سے بہتر طور پر ملتی رہے اور اس دنیا کو بہتر سے بہتر انسان بھی میسر آرہے ہوں۔ یہ بھی بات اہم ہے کہ بہتر انسانوں کے پاس ہی بہتر ٹیکنالوجی ہو سکتی ہے ورنہ آج امریکہ کے نیو قدامت پرستوں کی طرح کے انسان دنیا کے وجود کے لئے ہی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ ٹیکنالوجی انسان کی مادی اور جسمانی ضرورتیں تو آسانی سے پورا کر سکتی ہے، لیکن یہ فرحت اور

روحانی مسرت نہیں دے سکتی اور سرمایہ دارانہ بے لگام مقابلے کی دوڑ میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ آپ کے پاس دنیا کا سب کچھ ہے مگر دل کا سکون نہیں، ایک اندر کی فرحت اور مسرت نہیں ہے۔ کچھ تھوڑا ٹھہراؤ، کچھ سکوت، ایک بے خلل، بے اضطراب خوبصورت ماحول اور اوقات میسر نہیں تو انسان تمام تر آسائش کے بعد بھی خود کو محروم ہی محسوس کرے گا، آپ سونے کے محل میں رہ رہے ہیں اور اندر سے خالی محسوس کر رہے ہیں۔ آپ کو اپنا وجود، اپنی ساری سرگرمیاں بالآخر فضول، بیکار اور بے معنی سی لگنے لگتی ہیں۔ اصل میں روحانیت کا مطلب مادی ثروت کے ساتھ ساتھ انسان کو اندر سے باثروت کرنا ہے، اسے ایک سکون، اطمینان اور احساس آسودگی دینا ہے، تاکہ انسان کو بظاہر خوشحال، لیکن کھوکھلے پن اور بے معنویت کا شکار بننے سے روکا جائے وہ اپنے آپ کو ذاتی زمان ومکان سے پرے خود کو کائنات کی ابدیت کا حصہ سمجھیں۔ آج کے جدید انسان کو ایک طرف دنیاوی آسائش، رقص وسرور میں ہی خوش ہو، اور دوسری طرف اس کے اندر بدھا Buddha بکا روپ ہو۔ اگر آج اور کل کے انسان کو اور اس کی دنیا کو خوبصورت دیکھنا اور بنانا ہے جس میں عقائد کی نظر میں، نسلی وقومی امتیازات، جنگیں، اسلحہ سازیاں، غربت اور جہالت کے سمندروں میں خوشحالی کے جزیرے نہ ہوں تو اندر اور باہر کی ثروت میں توازن ضروری ہے۔ انسان سائنسی اور ریشنل سوچ کا حامل ہو۔ اور ساتھ اندر گہرائی اور وسعت ساری کائنات کو محبت کی نگاہ سے دیکھنے والا ہو۔

فروغ فرخ زاد

وہ لڑکی، جس کی تہذیب فطری جاذبیت پر نہیں بلکہ علم اور خیالات پر مشتمل ہے، شوہر حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے، کیونکہ وہ ان شعبوں میں بے جا مداخلت کرتی ہے جن پر صدیوں سے مرد بلاشرکت غیرے قابض رہا ہے۔

(نشاط فلسفہ۔ ول ڈیورانٹ)

انفرادی سطح پر کسی ماحول سے بغاوت اور آزادی کا بیج کن حالات میں پھوٹتا ہے، شاید اس کا انحصار حالات پر کم اور کسی مخصوص لمحے پر زیادہ ہوتا ہے ورنہ محرومی اور ظلم کے ماحول سے کروڑہا لوگ زمانوں سے گزر رہے ہوتے ہیں اس احساس کے بغیر کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ چنانچہ 5 جنوری 1935ء کو ایران کے قدامت پرست سماج میں فروغ فرخ زاد کی شکل میں ایک لمحہ بغاوت جنم لیتا ہے، اس طرح کے معاشروں میں کسی بھی باشعور عورت کے لیے سب سے پہلا سوال اس کا اپنا بدن بنتا ہے، کیونکہ اسی بدن کی مخصوص ساخت کی وجہ سے سماج نے عورت ذات کی نفی کا جواز پیدا کیا ہے چھوٹی عمر سے ہی لڑکی ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے۔ ثانوی درجے کی ایک ایسی ذات جو معاشرے کے اخلاق واقدار کو الٹ پلٹ دینے کی امکانی صلاحیت رکھتی ہے۔ عورت کے لئے خود اس کی ذات گناہ کا سرچشمہ اور وجود بوجھ بن جاتا ہے، لیکن فروغ نے اپنی ذات اور بدن کو گناہ کا ماخذ ماننے سے انکار کردیا اس کے لئے اس کی ذات، فخریہ، بدن فطرت کی خوبصورت تخلیق اور وجود مرد کے برابر حیثیت کا حامل تھا۔

فروغ کے بچپن کے واقعات کا علم زیادہ تر اس کی بہن اور بھائی سے ملتا ہے۔ اس کی بہن کے مطابق ان کی ماں حکم اور ضابطے کی غلام تھی وہ گھریلو فرنیچر کا حصہ معلوم ہوتی تھی، جسے مخصوص

ترتیب اور احتیاط سے رکھ دیا گیا ہو وہ جب کہیں باہر جاتی گھر کو تالہ لگا جاتی، بچوں کی ذرا سی نافرمانی سخت اور لازمی سزا کی مستوجب قرار پاتی۔ ہمارے گھر میں قاعدے، قانون اور ان کی خلاف ورزی کے درمیان تصادم چلتا رہتا، جس کے نتیجے میں تنازعہ، آہ وفغاں اور آپس میں بول چال بند ہو جاتی۔ اس کی بہن کا کہنا ہے۔ عسکری نوعیت کے اس سخت گھریلو ماحول کے ردعمل میں فروغ نے بڑے ہو کر خود مختار زندگی اپنائی اور اپنے اظہار میں دلیرانہ لہجہ اختیار کیا، بقول فروغ کی بہن ہم سب بچوں میں خود مختار طبیعت، پھٹ پڑنے والے مزاج اور ناقابل مصالحت صاف گوئی کی خصوصیات آگئیں جس کی وجہ سے ہمارے ذہنی (Intellectual) اور فنکارانہ تجسس کو مہمیز ملا۔ یہ تبدیلیاں کہیں الگ تھلگ ماحول میں وقوع پذیر نہیں ہو رہی تھیں، اس وقت ایران کی معاشرتی اور سیاسی فضا جدید مغربی دنیا کے اثرات سے متاثر ہو رہی تھی۔ فروغ کے باپ کی گھر میں اپنی ذاتی لائبریری تھی اور اس نے سکول جانے سے پہلے ہی بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا۔ فروغ کو گرمیوں کا موسم اچھا لگتا کہ سونے کو چھت کی کھلی فضا ملتی تھی، دیواروں سے بے زاری اور کھلی فضاؤں سے فروغ کی بچپن سے محبت ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق مستقبل کی باغی فروغ فرخ زاد کا پتہ دیتی ہے۔

اس کے بھائی کے بیان کردہ ایک واقعے کے مطابق ایک بار دونوں بھائی دوسری منزل کی بالکونی پر کھڑے ہو کر نیچے دھار مار کر پیشاب کرنے لگے اور فروغ کو طعنہ دے کر آواز دی۔ دیکھو جو ہم کر سکتے ہیں تم نہیں کر سکتی۔ فروغ نے جواب دیا۔ میں بھی کر سکتی ہوں۔ اور بالکونی کے کنارے کھڑے ہو کر ان جیسا عمل دوہرا دیا۔

فروغ اپنی بہن کے ساتھ مخلوط سکول میں جاتی تھی۔ اس طرح کے سکول ملائیت کے اثر سے آزاد تھے اور تعلیم کو مغربی طرز پر چلانے کی شاہ کی پالیسی کا حصہ تھے۔ فروغ کے لئے سردیوں کا آخری مہینہ سال نو کے تہوار کی آمد کی وجہ سے بڑا پر مسرت اور ولولہ انگیز ہوتا تھا۔ فروغ کا ہمیشہ دل چاہتا کہ وہ تہوار کے آنے سے پہلے ہی نئے کپڑے پہن کر سکول چلی جائے ایک بار اس بات پر فروغ کی خوب پٹائی ہوئی، اس رات جب فروغ کے آنسو رکے تو وہ اپنے بستر پر لیٹی ہنس پڑی کیونکہ وہ ہماری زندگی کا پہلا تہوار تھا جس سے ہماری ضابطہ شکنی کی خو کا آغاز ہوا تھا۔ نوعمری میں ہی فروغ کی اپنی ساتھیوں سے کچھ خاص نہیں بنتی تھی، اس کا مزاج اوروں سے مختلف تھا وہ انجانی

راہوں پر تنہا سفر کے لئے نکلنے والی تھی وہ ابھی سے مجمع میں خود کو گم نہیں کر سکتی تھی اسے ہواؤں کے مخالف چلنا تھا، وہ تیرہ سال کی عمر میں ہی سخت متجس بن چکی تھی، کئی بار مار پڑنے کے باوجود اس کی متلاشی طبیعت باز نہ آتی۔ گیارہ سال کی عمر میں ہی اس نے لٹریچر میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور تیرہ سال کی عمر میں شعر کہنے لگی۔

چودہ پندرہ سال کی عمر تک فروغ اپنے کو خاص کشش کا حامل نہیں سمجھتی تھی، دونوں بہنیں آپس میں محبت اور جنس کی باتیں کرتیں، لیکن ان کے بارے میں ان کی معلومات اس وقت کی رومانی کہانیوں اور اس طرح کے رسالوں کے فراہم کردہ مواد تک محدود تھیں۔ فروغ بلوغت کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اور زیادہ خاموش طبع ہو گئی۔ اس کی 1960ء کی ایک نظم کچھ اس طرح کے احساسات کو پیش کرتی ہے۔

وہ بلوغت کا پہلا دن یاد آتا ہے۔
جب میرے سارے بدن نے ایک معصوم سی حیرانی کو کھولنا شروع کر دیا
مبہم، گنگ اور نامعلوم ملے جلے احساسات کے ساتھ۔
ایک اور نظم کچھ یوں ہے۔
بدن کے رازوں کے وہ حیران کن دن
جب میرا تعارف ہو رہا تھا ایک خوبصورت زیبائی رگوں والے ہاتھ سے
اور پشت کی دیوار سے دوسرا ہاتھ ایک پھول لئے اشارے سے بلا رہا تھا
وہ محبت تھی اور اس کا کپکپاتا احساس
جو برآمدے کی تاریکی میں ہمیں اچانک لپیٹ لیتا
اور ہم اپنی جلتی سانسوں کی گرمی اور دھڑکتے دلوں کی مستی
میں ڈوب جاتے۔

فروغ کی زندگی کا ایک افسوسناک پہلو یہ رہا کہ وہ رسمی تعلیم کے مدارج مکمل نہ کر سکی، جب کہ اس کے تمام بہن بھائیوں نے اپنے اپنے میدان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ شاید اس جیسی بے چین روح تعلیم کی رسمی تکمیل کا انتظار نہ کر سکی اور اس نے نوعمری میں ہی حالات کے بھنور میں چھلانگ لگا دی تا کہ اس کائنات کے عمل سے پھوٹنے والی زندگی اور انسانی ساختہ تہذیب کے

سب مدو جزر سے خود کو گزار سکے۔ ایک بار پینٹنگ کی کلاس میں اس کے بنائے ہوئے اسکیچ پر جب ٹیچر نے اعتراض کیا تو فروغ نے جھنجھلا کر کہا۔ تمہاری خواہش ہے میں ویسا ہی دیکھوں اور پینٹ کروں جیسا کہ تم چاہتے ہو یہ کہہ کر وہ سٹوڈیو سے نکل گئی اور پھر وہاں لوٹ کر نہ آئی

جب فروغ سولہ سال کی ہوئی تب اس کی آزاد روی، فنون لطیفہ میں دلچسپی اور آس پاس کے لڑکوں سے میل جول جیسی حرکات والدین کے لئے پریشانی کا باعث ہونے لگیں۔ اس دوران فروغ کو اپنے ایک دور کے رشتے دار پرویز شاہ پور سے محبت ہوگئی۔ جس کی عمر فروغ سے دوگنا زیادہ تھی وہ اپنی خوش طبعی اور ظریفانہ کہانیوں سے محفل کو جما لیا کرتا تھا، فروغ نے والدین کی ناراضگی کے باوجود اس سے شادی کا فیصلہ کرلیا، جسے بعد میں فروغ نے سولہ سال کی احمقانہ محبت سے تعبیر کیا۔ اس کی بہن کے اندازے کے مطابق فروغ شاہ پور کی محبت میں اس لئے مبتلا ہوگئی کہ اس وقت اسے کسی بھی شے سے زیادہ ہمدردی اور شفقت کی تلاش تھی، جبکہ ہمارے باپ نے سرد مہری اور درشتی کے سوا کچھ نہ دے رکھا تھا۔ پھر بھی یہ بات اہم ہے کہ فروغ نے ناپختہ عمر، جذباتی فیصلے اور گھریلو گھٹن کے باوجود خود کو کسی ایرے غیرے کے سپرد نہیں کیا شاہ پور ایک اچھے عہدے پر فائز ہونے کے علاوہ صاحب مطالعہ اور صائب الرائے آدمی تھا، فروغ اس کے ساتھ کھلے دل سے بات کرسکتی تھی اور اس سے مشفقانہ رانمائی اور حوصلے کی توقع کرسکتی تھی۔ نو ماہ کے بعد اس کے ہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ ایک دوکاندار کے مطابق فروغ اکثر تنگ لباس اور شارٹ سکرٹ میں اپنے بچے کو Pram میں ڈالے بازار سے گزرا کرتی تھی۔

1954ء کے ایران میں بہت ہی کم عورتیں اس طرح کا لباس پہننے کی جرات کرسکتی تھیں، جو جسمانی خدوخال کے اظہار کا باعث ہو خاص طور پر شادی سے پہلے، کیونکہ ایسا کرنے سے آوارہ مزاجی کا تاثر پیدا ہوسکتا تھا البتہ شادی کے بعد عورت کے کریکٹر کا ضامن چونکہ خاوند بن جاتا۔ لہٰذا انہیں میک اپ کرنے اور قدرے سٹائلش لباس پہننے کی اجازت مل جاتی جس سے ان کی انفرادیت کا اظہار ہوسکتا، لیکن فروغ ان قابل قبول حدود کو بھی پھلانگ رہی تھی وہ سماجی تقریبات میں بغیر آستین اور ضرورت سے زیادہ قطع وبرید کا لباس پہن کر جاتی۔ لپ سٹک، بھاری میک اپ بنی ہوئی بھنویں اور جدید ترین ہیئر سٹائل سے ایسے لگتا تھا جیسے وہ سیکسی ہونے کا شعوری اظہار کر رہی ہو۔ فروغ کے روایتی وضع قطع کو ترک کرنے کا مطلب قدامت پرست معاشرے کا ہی ردعمل

تھا، جو سب کو باجماعت چلنے پر مجبور کرتا ہے اور جہاں منفرد ہونا جرم قرار پاتا ہے۔ اسے یہ بتانا بھی مقصود تھا کہ روایتی اور قومی لباس کے نام پر کسی فرد کی ذات کو دبانا، اس کی شناخت چھیننا اور انسانوں کی انفرادی مسرتوں پر پابندیوں کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے دوست احباب بتاتے ہیں کہ فروغ کے اطوار میں عشوہ گری کے اظہار کا واضح مطلب اپنی انفرادیت کا اعلان اور ان شخصی معاملات میں سوسائٹی کی طرف سے احکامات کو ماننے سے انکار کرنا تھا، عورت کی شخصیت کو دبانے اور اس کی ذات کو محدود و کنٹرول کرنے کے لئے پردے کا نفاذ ایک بہت بڑا ہتھیار ہے۔

فروغ حسن کا کوئی کلاسیک نمونہ نہ تھی، البتہ جواں سال پرکشش جسمانی خدوخال سے بھرپور قوت حیات ٹپکتی تھی۔ رفتہ رفتہ ادبی اور شاعرانہ حلقوں میں فروغ زیادہ سے زیادہ سرگرمی سے حصہ لینے لگی، لیکن یہاں اسے انہی مسائل کا سامنے ہونے لگا جو اخلاق کے ان ٹھیکیدار معاشروں کے مرد کسی بھی عورت کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ جو کچھ کر گزرنے کا عزم لے کر گھر سے باہر قدم رکھتی ہے۔ ایک طرف مردوں کو اس بات سے تکلیف ہوئی کہ ایک عورت شعر و ادب کے خالصتاً مردانہ ڈبے میں پورے طمطراق سے آبیٹھی ہے دوسری طرف فروغ کو مفت کا مال سمجھ کر ہر ایک نے ڈورے ڈالنے شروع کردیئے، جیسے وہ ادب و دانش کے مراکز میں نہیں کسی بازار میں چلی آئی ہو خاندا اینہ نامی ایک میگزین نے فروغ کی نظموں کے ساتھ متن کے درمیان برہنہ عورت کی سیاہ تصویریں (Silhouette) شائع کیں۔ مقصد یہ تھا کہ فروغ کے امیج کو مسخ کرکے اس کی شخصیت اور شاعری کے مثبت اور ترقی پسندانہ پہلوؤں کو قاری کی نظروں سے اوجھل کیا جائے عورت یا تو ایک مرد کی مقبوضہ ملکیت بن کر گھر کی چار دیواری میں اپنی زندگی کے دن بسر کرے یا پھر ہر مرد کا تر نوالہ بن کر رہے۔ اس کے علاوہ عورت کا تاریخ اور معاشرے میں کوئی روپ نہیں ہو سکتا۔ وہ ذہنی و مادی تخلیقی عمل میں برابر کی سطح پر شرکت نہیں کرسکتی، لیکن فروغ ایرانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے پر تل گئی۔ ادبی رسائل اور اخبارات کے ایڈیٹروں سے ملنے کے لئے اسے تہران کا اکیلے ہی سفر کرنا پڑتا۔ شروع میں شاہ پور نے اپنی بیوی کی فنکارانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی، حالانکہ فروغ کے اپنے گھر والے ناخوش تھے کہ شاہ پور نے اپنی جوان بیوی کو بہت آزادی دے رکھی ہے۔ اس دوران افواہیں شروع ہوگئیں کہ فروغ کے کئی عاشق بھی ہیں، چنانچہ ان کی شادی 1956ء میں ناکام ہونے لگی۔ فروغ نے اس پر ایک

ہی مضمون کی حامل بہت سی نظمیں لکھیں۔

میں پناہ مانگتی ہوں ان لوگوں سے
جو سامنے مری نظموں کو سن کے
خوشبو اور پھولوں کی طرح مسکراتے ہیں
لیکن یہی مرد اپنی خلوت میں مجھ کو
بدنام اور دیوانہ عورت قرار دیتے ہیں

معاشرے کی ریاکاری پر ایک اور نظم

خستہ، افسردہ اور بدحال
میں اپنی ذات کے کھنڈروں کی طرف رواں ہوں
بخدا میں تمہارے شہر سے اپنا
شوریدہ و دیوانہ دل واپس لیتی ہوں
اسے لے کر دور جا رہی ہوں تا کہ
اسے دھو سکوں
رنگ گناہ سے
داغ محبت سے اور
تمام بے جا اور سڑی ہوئی خواہشوں سے

ایک دوسری نظم بعنوان سرکشی میں اپنے اندر کی حالت یوں بیان کرتی ہے۔

اپنی ذات میں کم مردانہ مخلوق
آؤ میرے در قفس کو وا کرو
میں وہ پرندہ ہوں جس کے سر میں
پرواز کی خواہش کب سے مچل رہی ہے
آؤ میرے دروازے کو کھولو تا کہ
میں اپنے پروں کو پھیلا سکوں

شاعری کے روشن آسمان کی طرف
اگر مل جائے پرواز کی اجازت مجھے
میں شاعری کے گلاب باغ کا پھول بن جاؤں

فروغ کی شاعری کا پہلا مجموعہ اسیر 1955ء میں چھپا، اس کی شاعری میں مرد، مغرور، قابض، سمجھ میں نہ آنے والا، بے وفا اور فاتح بدن کی صورت اُبھر کر سامنے آتا ہے جو محبت کے سحر سے ناواقف ہے اور ہر عورت کو استعمال کی چیز سمجھتا ہے، جبکہ اس مجموعہ کی نظمیں ایک نوجوان عورت کے حیات آفریں جذبات، لذت حواس Sensual Pleasures اور اس کی خوش امیدی کو بڑھاوا دیتی نظر آتی ہیں۔ مجموعی طور پر اس کی نظمیں معاشرے کی قدامت پرستی کے اثرات سے آزاد تھیں وہ بطور ماں، شاعرہ اور جوان بیوی کے اپنے متصادم جذبات اور شکوک سے گزر رہی تھی، فروغ لائف سٹائل میں انفرادیت اور شاعری میں جدیدیت جیسی بدعتوں کا ایک ساتھ ارتکاب کر رہی تھی فروغ کا المیہ یہ تھا کہ پہلے باپ نے، پھر خاوند نے اس کی فن کے ذریعے اپنی انفرادیت کے علمی اظہار کرنے پر حوصلہ افزائی کی، لیکن بعد میں اسے سماج کے لئے قابل قبول ہونے اور روایتی اقدار کی پاسداری کے لئے مجبور کرنے لگے، وہ اپنی ایک نظم خانہ متروک میں اپنے احساسات کا اظہار یوں کرتی ہے۔

اب میں جانتی ہوں دور ہوتے گھر سے
زندگی کی خوشیاں اُڑ چکی ہیں
میں جانتی ہوں آنکھوں میں آنسو لئے بچے کو
جو اپنی ماں سے علیحدگی کے غم میں مبتلا ہے
لیکن میری تھکی اور مضطرب روح
خواہشوں کی شاہراہ کی طرف رواں ہے
شاعری میری محبت ہے، وہی میرا پرسہ ہے
میں اپنے محبوب کی تلاش میں جا رہی ہوں

فروغ نے بچے اور خاوند کے لئے اپنی ذات کو قربان کرنے سے ایک بار پھر انکار کر دیا معاشرہ اسے زندہ درگور کرنا چاہتا تھا دوسری لاکھوں کروڑوں عورتوں کی طرح جن کی اپنی کوئی

ذات نہیں وہ مرد کے نام سے منسوب ہیں۔ فروغ مرد کو ساتھی تو سمجھ سکتی تھی اپنا شناختی کارڈ نہیں۔ وہ سب دُکھ سمیٹتی چلی گئی، لیکن اپنی ذات کی نفی نہ ہونے دی۔ معاشرہ اپنے غلاموں کو صرف اسی حد تک آزادی دے سکتا ہے جس میں مفاد پیوستہ کو نقصان نہ پہنچے، لیکن فروغ کے آزادی آشنا شعور کے سامنے حدود و قیود اب کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں، اس نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور شاہ پور سے طلاق لے لی، اس کے بھائی کے الفاظ میں:

اب میری بہن کو یا تو شاہ پور کے پدرانہ رویے کی ضرورت نہیں تھی یا وہ اسے مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی، دراصل نہ ہی فروغ اور نہ شاہ پور اس کا اندازہ کر سکتے تھے کہ وہ اتنی جلدی شاہ پور سے بڑی ہو جائے گی طلاق کے بعد اگرچہ شاہ پہلوی کے نئے عائلی قوانین کے مطابق بچہ اسے مل سکتا تھا، لیکن اس نے بچے کو باپ کے پاس ہی رہنے دیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جن راہوں کا سفر اختیار کر چکی ہے وہاں بچے کی پرورش کی ذمہ داری نہ اُٹھائی جا سکے گی اسے ہم سنگدلانہ فعل سے تعبیر نہیں کر سکتے، جبکہ یہ سراسر ہوشمندی کی بات تھی اس کا اپنا مستقبل غیر معین تھا، بچے کو پاؤں کی زنجیر بنا لیتی تو اسے کئی سمجھوتے کرنے پڑتے، وہ گھریلو بیوی بن کر نہیں رہ سکتی تھی، وہ ایک آزاد پنچھی کی طرح چار سو پھیلی فضاؤں کو چھو کر دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے بنی بنائی اقدار قبول نہیں تھیں۔ وہ تجربات کی بھٹی سے گزر کر اپنی اقدار خود پیدا کرنا چاہتی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ ابھی کتنی امکانی ٹھوکروں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ جس سے وہ ممتا کے کردار کو نہ نبھا سکے گی، اپنی ذات اور شاعری سے کمٹمنٹ کے لئے ایک خود مختار طرزِ زندگی اور روایتی نسوانی کرداروں سے انکار ضروری ہو گیا، اگرچہ اس بات کا تعلق اسے ساری زندگی رہا کہ اس نے اپنے بچے کو مادرانہ شفقت اور رفاقت سے محروم رکھا۔ فروغ نے چونکہ معاشرے اور مرد کی اطاعت گزاری سے انکار کیا تھا، لہٰذا اس کے لئے زیادہ سے زیادہ اذیت کا سامان پیدا کرنے کے لئے فروغ کے سسرال والوں نے نہ صرف اپنے بچے کو ملنے کی کبھی اجازت نہ دی، بلکہ بچے کے ذہن میں بھی ماں کے بارے میں نفرت پیدا کر دی۔

خاوند سے علیحدگی کے بعد وہ کچھ عرصہ اپنے والدین کے گھر رہی، کسی نے سچ کہا ہے کہ عورت کا اپنا کوئی گھر نہیں ہوتا طلاق یافتہ بہن یا بیٹی کو کوئی خوشی سے واپس نہیں رکھتا، فروغ کی ویسے بھی باپ کے ساتھ نہیں بنتی تھی، چنانچہ خاندان کی عزت کو خاک میں ملانے پر اس نے بیٹی کو نکال باہر کیا، وہ چند ماہ اپنی ایک واقف کار خاتون کے ہاں چلی گئی جس نے فرانس سے تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔

ان دو عورتوں کے اکیلے ساتھ رہنے پر بھی۔ سکینڈل شروع ہو گئے۔ مرد، مرد ہی ہوتا ہے، دانشور ہو یا ادیب۔ سب کے نزدیک عورت گوشت پوست کے علاوہ مشکل سے ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ عورت اپنے آپ کو ایک فرد اور شخص کے طور پر منوانے کی لاکھ کوشش کیوں نہ کرے۔ سارا کھیل مرد کھیلتا ہے، پھر وہ عورت کی بدنامی کے مزے بھی لیتا ہے، مردوں کی طاقتور اور برتر حیثیت کی وجہ سے ان کے عیوب زیرِ بحث نہیں لائے جاتے، جبکہ عورت اپنی کمزور حیثیت کی وجہ سے تماشا بنتی ہے۔

فروغ کی ذاتی زندگی کے بارے میں افواہوں میں اضافہ اس وجہ سے بھی ہوتا رہا کہ اس نے اپنی شاعری میں مرد عورت کے تعلق کے بارے میں اپنے جذبات واحساسات کا اظہار معمول سے زیادہ کھلے لفظوں میں کر دینے میں تامل محسوس نہ کیا، ادھر مرد قارئین خورد بینی نظروں سے نظموں کا آپریشن کر رہے تھے کہ نظم میں مذکورہ مرد۔ فروغ کا منکوح ہے یا کوئی دوسرا، فروغ چونکہ بندشوں کی بجائے آزادیوں، چھپانے کی بجائے کھلا رکھنے کی داعی تھی وہ بڑی آسانی سے نظموں میں صیغہ غائب استعمال کر سکتی تھی، لیکن وہ ہمیشہ واحد متکلم کا استعمال کرتی۔ مصیبت یہ تھی کہ فروغ ایک ایسے سماج میں جنم لے چکی تھی جس کا سارا ڈھانچہ صرف ایک لفظ منافقت کے گرد گھومتا ہے۔ اس سوسائٹی کا ہر شخص دوسرے کے ساتھ ہی نہیں۔ خود اپنے ساتھ بھی ہر وقت منافقت کی زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے، ہم اپنے جذبات اور مزاج کی موزونیت کے حساب سے ہر لمحے گناہ وثواب، نیکی و بدی، حرام وحلال اور ایمان وکفر کی تعبیریں بدلتے رہتے ہیں۔ فروغ معصوم تھی، وہ بات اپنی فطری صاف گوئی سے کر دیتی۔

یہ سارا ہنگامہ اس کی نظم گناہ سے اُٹھا۔ جس میں وہ کسی مرد کے ساتھ اپنے ملاپ کے تاثرات اور کیفیت کو بیان کرتی ہے، اس کی بہن کے مطابق اس نظم کا مذکورہ مرد دراصل اس ادبی رسالے کا مدیر ہی تھا جس میں یہ نظم پہلی بار چھپی تھی۔ اس کے ساتھ پہلے خط وکتابت ہوئی بعد میں وہ اسے ملنے تہران بھی جاتی رہی۔ بنیادی طور پر معاملہ ایک رائٹر اور ایڈیٹر کا تھا، لیکن لگتا ہے اس دوران وہ کچھ دیر کے لئے ایک دوسرے کے قریب آ گئے، لیکن اس واقعہ پر جو شور مچا اس پر فروغ خود ہل کر رہ گئی۔ وہ سادہ دل جوان عورت تھی۔ زندگی کی اونچ نیچ سے ناواقف، جبکہ وہ تجربہ کار مرد تھا۔ ایک بھیڑیا جو بارش کو ہوتے دیکھ چکا تھا اپنے تعلقات کو مرچ مسالہ لگا کر افسانوی شکل میں چھاپنا شروع کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد فروغ کی زندگی سخت ترین طوفان میں گھر گئی۔ طلاق، بچے سے جدائی،

چاروں طرف سے طعن وتشنیع ،اپنے خاندان سے ٹھکرایا جانا اور احساس تنہائی۔ان سب کا دباؤ فروغ کی قوت برداشت سے زیادہ تھا۔اس پر اعصابی بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا وہ نفسیاتی امراض کے کلینک میں ایک مہینہ زیر علاج رہی اس پر بھی ادبی دنیا نے ہمدردانہ رویہ اختیار نہ کیا، خاندا ینہ میں اس کے حالات یوں چھپے۔افواہ ہے فروغ پاگل ہوگئی ہے۔ہسپتال سے نکلنے کے بعد فروغ نادر پور کے ہاں ٹھہرنے کے لئے چلی گئی جو اس وقت کا مشہور شاعر تھا۔یہ فروغ کا کسی ادبی شخصیت سے دوسرا افیر تھا۔نادر نے فرانسیسی ادب میں گریجویشن کی ہوئی تھی اور وہ عصری ادب کے جدید رجحانات سے واقف تھا، لیکن ان کے تعلقات جلد ہی ٹوٹ گئے۔نادر پور کو محسوس ہوا کہ فروغ کے ساتھ رہنا بہت دباؤ والی بات ہے مسئلہ مردانہ شاونزم کا تھا۔ایک آزاد، باشعور اور صاحب صلاحیت عورت اچھی تو لگتی ہے، لیکن مردانگی کا آبگینہ کسی وقت بھی چور ہونے کے امکانات ہوسکتے ہیں۔جب ایسی عورت ذہنی یا شخصی سطح پر اپنی آزادی کے اظہار کی کوشش کرتی ہے۔

اسیر کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت پر فروغ نے لکھا۔میں اپنی استقلالی قوت سے اپنے حصے کا فرض ادا کر جاؤں گی۔فن کو گلے سڑے حالات سے نکالنے اور زندہ رہنے کا حق ہر ایک کو دلانے میں۔خاص طور پر عورتوں کو یہ جرات دے جاؤں گی کہ وہ اپنے جذبات اور پوشیدہ جبلت پر پڑے پردوں کو ہٹا سکیں۔وہ اس قابل ہوسکیں کہ اپنے دل کی بات الجھن اور خوف کے بغیر کہہ سکیں کہ دوسرے لوگ کیا کہیں گے۔میں جب عصری یا کلاسیکی ادب کا مطالعہ کرتی ہوں تو میں دیکھتی ہوں کہ مرد ہر جگہ اپنی محبت اور محبوب کا ذکر بڑی آزادی اور صاف گوئی سے کر جاتے ہیں۔اپنے محبوب کا مقابلہ کسی بھی چیز سے کر لیتے ہیں اور محبوب کی طرف سے محبت کے تمام مرحلوں کو بیان کر دیتے ہیں۔لوگ یہ سب کتابیں بغیر کسی اشتعال کے پڑھ ڈالتے ہیں، کوئی شور نہیں مچاتا۔فروغ کا کہنا تھا کہ اس طرح کا شور شرابہ میری نظموں کے موضوعات کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ ان احساسات کا اظہار پہلی دفعہ ایک عورت کی طرف سے کیا گیا ہے شاعری دل کی زبان ہے اور میں ایک عورت ہوں، میرا دل اور جذبات مرد کے دل میں بسنے والے جذبات سے مختلف ہیں ظاہر ہے اگر میں مرد کی زبان میں بات کروں گی تو وہ میرے دل کی بات نہ ہوگی۔

فروغ پدرشاہی نظام کے ثقافتی اثرات کے تحت ہزاروں سال سے دفن عورت کو اپنی ذات لوٹا رہی تھی۔اسے اپنے جسم پر بھی اختیار دے رہی تھی اور زبان پر بھی، سماج کے سب مینار بل

رہے تھے۔اس عورت کو زندہ دفن کرنے پر پورا سماج یکجا تھا۔علم وادب کے ٹھیکیدار بھی حکمران اور ملا بھی، وہ زمانہ فروغ کے لئے بہت کٹھن تھا۔اس کی کوئی آمدنی نہ تھی۔واقف کار بتاتے ہیں کہ فروغ کا اضطراب اس کے مزاج میں جارحیت پیدا کر رہا تھا، لہٰذا شاعروں کے ساتھ اس کی بحث وتکرار اور جھگڑا ہو جاتا۔اس دوران اس کا دوسرا مجموعہ دیوار بھی چھپ گیا۔

جولائی 1956ء میں فروغ پہلی دفعہ یورپ کے سفر پر روانہ ہوئی، پیسوں کی کمی کی وجہ سے اس نے مشہد سے مہریار تک کا سفر کارگو فلائٹ سے کیا۔ادبی رسالے اسے ایک قابل ذکر شاعرہ تو قرار دے رہے تھے، لیکن اس کی شاعری کو دل کی شکلیں بنا کر فریم کیا جاتا۔ظاہر یہ کرنا تھا کہ فروغ کی شاعری سنجیدہ نہیں ہے۔مردانہ بیمار ذہنیت فروغ کی شاعری سے لذت کشید کرنے پر تلی ہوئی تھی۔اس سے ان کا مقصد عورت ذات کی توہین بھی تھا اور اسے مردوں سے کمتر درجے کا شاعر بھی قرار دینا تھا۔وہ عورت کو اپنے تصوروں کے مطابق ہی دیکھنے پر مجبور تھا، لہٰذا فروغ کچھ وقت اس ماحول سے پرے گزارنا چاہتی تھی، وہ تہران میں اپنی زندگی کو یوں بیان کرتی وہ ایسا تاریک غار تھا جس میں روشنی کی طرف جانے والے رستے کھو چکی تھی۔میں عورت بننا چاہتی تھی ایک انسان، میں کہنا چاہتی تھی کہ مجھے بھی سانس لینے کا اور کچھ کہنے کا حق ہے، لیکن سب میرا گلہ گھونٹنا چاہتے تھے، میرے لبوں اور سانسوں کو خاموش کر دینا چاہتے تھے، جیت کے سب ہتھیار ان کے پاس تھے، میں ہنس بھی نہیں سکتی تھی یہ نہیں کہ میری ہنسی ختم ہو چکی تھی۔نہیں میری ساری طاقت نچوڑی جا چکی تھی۔چنانچہ تازہ قوت لینے کے لئے میں نے اس ماحول سے کچھ عرصہ دور ہونے کا فیصلہ کیا۔یورپ جا کر فروغ نے بھی وہی محسوس کیا جو پا کباز مشرق کا ہر باشندہ وہاں جا کر محسوس کرتا ہے جیسے وہ کسی قید سے باہر نکل آیا ہو۔ایسا لگتا ہے سب انسانی کمینگیاں، تنگ نظریاں، گندگیاں اور جہالتیں بہت دُور رہ گئی ہوں۔ہر چیز صاف ستھری، روشن اور کھلی لگنے لگتی ہے، سماج اور ریاست کی بے جا پابندیاں جو مشرقی فرد کو کچل دیتی ہیں، مغرب میں جا کر امن محسوس ہوتا ہے۔فروغ کے تاثرات ملاحظہ فرمائیے۔اس وقت میں تصور نہیں کر سکتی تھی کہ مغرب کا یہ سفر میرے ذہن اور سائیکی پر اتنا بڑا اثر ڈالے گا اور میرے کھوئے ہوئے سکون قلب اور صحت کو اس حد تک واپس لے آئے گا اس لمحے جب کہ میں یہ تحریر لکھ رہی ہوں، میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے زندگی میں اس سے پہلے اتنا سکون، پرامیدی اور قوت کبھی محسوس نہیں کی یورپ سے واپسی پر فردوسی نامی ایک جریدے نے

جہاں یورپ کے بارے میں اس کے تاثرات شائع کئے وہاں ایرانی، ادبی اور دانشور شخصیات پر مبنی ایک لسٹ بھی شائع کر دی، جن کا دعویٰ تھا کہ فروغ کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات ہیں۔ ایک نقاد نے اپنے مضمون میں فروغ کے بارے میں یوں لکھا۔ وہ اپنی زندگی اور شاعری دونوں میں سیکس کو استعمال کر رہی ہے۔ فارسی ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کرنے کے لئے ہماری معاشرتی روایت یہ ہے کہ ان عورتوں کو ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا ہے جو جنسی خواہشات کو تیاگ چکی ہوں۔ اگر وہ بھی جون آف آرک کی طرح کمتر نسوانی حیثیت میں اظہار کرنے کی صلاحیت رکھتی تو فروغ کو بھی کم منفی ردعمل برداشت کرنا پڑتا۔ مروجہ نظام میں عورت کی کسی طرح کی قائدانہ پوزیشن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی نسوانی اور جنسی حیثیت کو ترک کرے اور نام نہاد مردانہ صفات کو اپنائے ورنہ عورت ہونے کے ناطے سماج اس کی تضحیک اور تذلیل میں کوئی وار خالی نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے ہمارے مقدس نسوانی کرداروں کا امیج ایسے بنایا جاتا جیسے وہ اپنی زندگی کے جنسی پہلو سے عاری ہو چکی ہوں فروغ کی ایک خوبصورت لائن ہے۔ میرا شہر میری خواہشوں کا قبرستان ہے۔ ایک نظم میں فروغ اپنے بیٹے کو اس سے علیحدہ ہونے کی وجہ یوں بیان کرتی ہے۔

میں نے عزم کر لیا
ایک خود مختار شخص اور شاعر ہونے کا
ایک چیخ بننے کا
جو میرے وجود کا احساس پیدا کرے
افسوس
میں ایک عورت تھی
جب تمہاری معصوم آنکھیں دیکھیں گی
میری مبہم اور بے آغاز نظر کو
تمہیں ایک گہری جڑوں والی بغاوت ملے گی
جو میرے ہر نغمے کے دل سے پھوٹ رہی ہو گی
منافقوں کے اس گروہ کے ساتھ
جنگ کوئی آسان نہیں ہے

میرے اور تمہارے اس شہر میں
عرصہ ہوا شیطان اپنا آشیانہ بنا چکا ہے
ایک دن آئے گا جب تم
چشم حسرت سے میرے اس درد آلود نغمے کو
پڑھو گے اور مجھے میرے لفظوں میں تلاش کرو گے
اور خود سے کہو گے
میری ماں ایسی تھی۔

فروغ کس دنیا میں من کی خوبصورتی کی بات کر رہی تھی جہاں ظاہر داروں کا ٹولہ بستا تھا وہاں اس کو کون سمجھ سکتا تھا، اپنی ایک نظم خدائی سرکشی میں کہتی ہے۔ اگر وہ خدا ہوتی تو کیا کرتی وہ سورج کو تاریکی میں اور پہاڑوں کو سمندر میں پھینک دیتی۔ جنگلوں کو آگ لگا دیتی، قبروں اور آسمانوں کے ناپاک سبزہ زاروں سے اہل تقویٰ کے ارواح و اجسام کو نکال باہر کرتی۔ الٰہیات کے سنہری تاج کے بدلے آغوش گناہ کی تاریک اور درد آمیز لذت میں سما جاتی۔ فروغ کی زندگی اب ایک اور موڑ پر پہنچتی ہے۔ جہاں اس کی زندگی میں ابراہیم گلستان شامل ہوتا ہے۔ وہ نوجوانی کے زمانے سے ہی ادب اور فلم سے وابستہ ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ کمیونسٹ پارٹی میں رہا۔ تہران میں فری لانسر فوٹو گرافر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کی کہانیوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے تھے، بطور مصنف اس نے اس حقیقت پر زور دیا تھا کہ جس سوسائٹی میں ناخواندگی کا دور دورہ ہو وہاں لٹریچر اپنے اثرات مرتب نہیں کر سکتا، چنانچہ گلستان فلم سازی کی طرف راغب ہو گیا۔ فروغ کو جاب کی تلاش تھی۔ گلستان نے اسے بطور اسسٹنٹ اپنے فلم سٹوڈیو میں رکھ لیا۔ تعلقات کے شروع میں فروغ گلستان کی خود اعتمادی، جذبے اور اس کے آزادانہ مزاج سے متاثر ہوئی۔ اسے اظہار کے لئے نئے میدان ملتے نظر آئے، فروغ گلستان سے بہت انسپائر تھی، لیکن تہران کی دانشور کمیونٹی اس بات پر معترض تھی کہ فروغ کھلم کھلا ایک شادی شدہ شخص سے تعلقات رکھ کر سماج کی ثقافتی اور اخلاقی حدود کو پامال کر رہی ہے اس دباؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پھر مایوسی اور ڈپریشن کا شکار ہو گئی۔ ادھر فروغ کو پتہ چل گیا تھا کہ گلستان بھی محض اس کے ساتھ فلرٹ کر رہا ہے، انہی جھگڑوں کے نتیجے میں فروغ نے ایک بار خودکشی کی کوشش بھی کی۔

فروغ زندگی کے کرب سہتی رہی۔ زمانہ اسے شکست پر مجبور کرتا رہا۔ وہ زندگی کے سارے زہر لمحہ لمحہ اپنے اندر اتارتی رہی۔ وقتی طور پر ٹوٹ جاتی تو پھر ہمت باندھ لیتی۔ اس دوران فروغ نے خود کو فلمسازی کی طرف مشغول کرلیا۔ جدید ادب اور دانش وروں نے فروغ کو پہلی بار سنجیدگی سے دیکھا، ورنہ وہ ابھی تک سنسنی خیز طرز زندگی اور شاعری سے لوگوں کی توجہ مبذول کروانے والی سمجھی جاتی تھی۔ اس کی ایک فلم گھر سیاہ کا خوب چرچا ہوا۔ اس فلم میں کوڑھ کے مرض میں مبتلا لوگوں کی بستی دکھائی گئی، وہ دعاوں اور نمازوں کے زریعے اپنے مرض کا علاج ڈھونڈتے ہیں۔ جب کہ مرض سے آرام سائنس اور سرجری سے ہی آسکتا ہے۔ چنانچہ بغیر علاج کے سماجی کوڑھ نہ صرف باقی رہتا ہے بلکہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ فروغ نے مسلم معاشروں کے روگ کو سلولائنڈ پر جس کمال سے اتارا، اس پر اس کے فن اور شعور کو بہت سراہا گیا۔ وہ فیچر اور دستاویزی فلمیں بنانے میں بہت مصروف تھی، لیکن ضروری نہیں کہ خوش بھی ہو۔ 1962 کے ایک انٹرویو میں، میں محسوس کرتی ہوں، میں زندگی میں کھو گئی ہوں میرا علم اس سے بہت کم ہے جتنا کہ مجھے ستائس سال کی اس عمر میں ہو جانا چاہے تھا، شائد اس کی وجہ یہ رہی کہ میری زندگی درخشان نہیں رہی، سولہ سال کی عمر میں محبت اور مضحکہ خیز شادی نے میری بعد کی ساری زندگی کی بنیاد ہلا کر رکھ دیا، مجھے زندگی میں کوئی راہنمائی کرنے والا نہیں ملا، کسی نے مجھے روحانی اور زہنی تربیت مہیا نہیں کی۔ جو کچھ میرے پاس ہے، وہ میں نے خود ہی حاصل کیا ہے اور جو کچھ میرے پاس (علم وفن) نہیں ہے، وہ میرے پاس ہونا چاہئے تھا۔ لیکن غلط راہوں، خود آگہی کی کمی اور زندگی کے بند کناروں (Ends) نے مجھے وہ کچھ حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی، میں پھر سے شروع کرنا چاہتی ہوں۔ میرے خدوخال، شدت احساس اور بے ثمر نیک نیتی کا نتیجہ ہیں۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ سیکھنے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتی تھی، ابتدا میں وہ سہارے ڈھونڈتی رہی لیکن جو بھی ملا، یا تو حکم چلانے والا تھا یا پھر استعمال کرنے والا۔ ہر زی شعور انسان کی طرح اسے وقت کے کھو جانے کا احساس ہونے لگا تھا، اس لئے وہ اپنے تاریخی کردار کی ادائیگی میں اور زیادہ سرگرم ہوگئی۔

فروغ نے اب اسٹیج کے سنجیدہ اور آرٹ ڈراموں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس کے چوتھے مجموعے دوسرا جنم کو نقادوں نے جدید فارسی شاعری کی مختصر تاریخ میں سنگ میل قرار دیا، بقول نقادوں کے یہ واقعی فروغ کا دوسرا جنم تھا۔ اس نے خود ہی تسلیم کیا کہ اب شاعرانہ

بلوغت کے نشان آنے لگے ہیں۔ وژن، ڈکشن، اور امیجری کے علاوہ اس کا سماجی شعور بھی ترقی کر رہا تھا۔ اس کی ایک طنزیہ سیاسی نظم اے جواہر مرصع وطن قابل ذکر ہے۔

میں جیت گئی۔۔۔!
میں نے خود کو رجسٹر کرا لیا ہے
میری سب تکلیفیں اب ختم ہیں
مادر وطن کی مہرباں آغوش میں
مجھے تسلی دینے کے لئے عظیم الشان تاریخی روائت
میرے لئے لوری، تمدن وفرہنگ وثقافت
۔۔۔۔میری سب تکلیفیں اب ختم ہیں

لیکن بعض لوگ اب بھی اسے اپنی گندی ذہنیت کے ترازو پر تول رہے تھے۔ نگین نامی ماہنامہ کے ایڈیٹر نے مذکورہ نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا، فروغ کو ایک شناخت چاہئے تھی، جنسی آزادی کی، جب اس کی یہ خواہش پوری ہوگئی تو اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کی آزادی کتنی بے معنی ہے، چنانچہ اس نے جھوٹی شناخت کو موضوع بنا لیا ہے۔

فروغ کی شخصیت کا ایک پہلو تجزیہ طلب ہے۔ ایک آزاد اور خود مختار زندگی گزارنے کے باوجود اس نے اپنے مالیاتی وسائل نہیں بنائے۔ ایک باشعور عورت ہونے کے ناطے اس کا باپ، خاوند، اور محبوب پر مالیاتی انحصار اس کی سچی آزادی کے سوال پر شکوک ڈال دیتا ہے۔ عورت کی حقیقی آزادی کے لئے اقتصادی خود مختاری بڑی بنیادی شرط ہے۔ اس کی وجہ شائد یہ ہو سکتی ہے۔ کہ فروغ نے سسٹم کے خلاف اپنی لڑائی نوعمری میں ہی شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ اور اس کے بعد زندگی کی کشمکش میں پھسلتی چلی گئی۔ مزاجا اور نظریاتی طور پر بھی اسے حصول دولت سے دلچسپی نہ تھی۔ فروغ کی زندگی میں کچھ کمزوریاں ضرور رہ گئیں۔ لیکن زندگی کے کئی اسٹیشن ایسے ہوتے ہیں جو انسان سے مس ہو جاتے ہیں اور ان تک واپس بھی نہیں جایا جاسکتا۔ فروغ نے اپنی گزری زندگی پر جب بھی نظر ڈالی، اسے اپنی کئی حرکتوں اور فیصلوں پر پچھتاوا ہوا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ سمجھ صرف واقعے کے بعد ہی آسکتی ہے۔ زندگی اور تاریخ کا عمل یونہی چلتا ہے۔ چنانچہ کچھ دھبے کسی شخصیت کی عظمت کو کم نہیں کر دیتے۔ اس کے آدرش اہم ہوتے

ہیں اور دیکھنا یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ لڑائی میں ثابت قدم کس حد تک رہا ہے۔

فروغ اب تیس سال کی ہو چکی تھی۔ بقول اس کے، 30 سال ایک عورت کی بلوغت کی عمر ہوتی ہے۔لیکن میری شاعری کا مواد اور مضامین 30 سال کی عمر کے نہیں۔ انسان کو پوری زہانت، شعور اور آگہی کے ساتھ زندہ رہنا چاہیئے۔ میں کنفیوزڈ رہی، میرے سامنے کوئی ٹھوس فکری نظام نہیں تھا۔ میں نے پڑھا ٹکڑے ٹکڑے کر کے اور زندگی بھی ریزہ ریزہ گزاری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا میں بیدار بھی دیر سے ہوئی۔ اگر میری شاعری میں نسائیت پائی جاتی ہے تو اس لئے نارمل ہے کہ میں عورت ہوں۔ مجھے اپنے عورت ہونے پر خوشی ہے۔لیکن فنی معیار حسن کے لحاظ سے جنس قابل غور نہیں رہ جاتی، فطری بات ہے ایک عورت جسمانی جذباتی اور نفسیاتی خصوصیات کے حوالے سے ان مسائل کو زیادہ مرکز نگاہ بنائے گی جن کی مناسب چھان بین شائد مردوں کے بس میں نہیں۔نسوانی وژن سے مراد وہ مسائل ہیں جو مردوں سے مختلف ہیں اگر میں صرف عورت ہو کر سوچوں تو ایک شاعر کی حشیت سے ہی نہیں ایک انسان کی حیثیت سے بھی جمود کا شکار ہو جاوں گی، ضروری چیز فرد ہونا ہے، عورت یا مرد ہونا نہیں۔

موسم بہار 1966 میں فروغ کو پھر یورپ جانے کا موقع ملا۔ وہاں سے اس کے خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ ان بالکل مختلف لوگوں کے بیچ، میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی ہوں کبھی تو دکھ سے میرا گلا جلنے لگتا ہے کہ ہم تاریخ کے بہاو سے کس حد تک کٹ چکے ہیں۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے، میرا دل تڑپ اٹھتا ہے کاش میں بھی کسی ایسی جگہ پیدا ہوتی جو حرکت و عمل کے مراکز کے قریب ہوتا، کتنی شرمناک بات ہے میری زندگی اور صلاحتیں ایک بیمار اور بے کار غار میں ضائع ہو گئیں۔ صرف اس لئے کہ مجھے اپنے وطن اور اس سے وابستہ یادوں سے محبت ہے۔ جب میں یہاں کی زندگی میں فرق دیکھتی ہوں، یہاں علم اور عمل ایسی قوت سے آگے بڑھتا ہے کہ تخلیقی اور تعمیری سرگرمیوں کی خواہش خود بخود بیدار ہونے لگتی ہیں۔ میرا ذہن تاریکی اور مایوسی سے بھر جاتا ہے اور میرا مرنے کو جی کرتا ہے۔ یہ ہیں وہ تڑپا دینے والے احساسات جن سے تیسری دنیا کا ہر ذی شعور فرد گزرتا ہے جب وہ مغرب کا مقابلہ اپنی جہالت میں مست تہذیب سے کرتا ہے۔ یہ کچھ نہ کرنے والا اور کچھ نہ کرنے کے قابل چھوڑنے والا معاشرہ ہے، فروغ کے اندر تخلیقی اور جمالیاتی صلاحتوں کا ایک آتش فشاں فطرت نے ودیعت کر رکھا تھا، لیکن سوسائٹی کو اس بات سے

دلچسپی تھی کہ فروغ نے آج رات کس کے ساتھ بسر کی ہے۔ یورپ سے واپس آ کر فروغ نے ایک پبلیشنگ ادارہ بنایا، جس کے تحت ایک ماہنامہ اور دیگر ادبی کتابیں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ جوں جوں وہ اپنی 32 ویں سالگرہ کے قریب آ رہی تھی وہ ایسی سرگرمیوں میں شریک ہو رہی تھی جہاں اسے تکمیل ذات کا احساس ہو سکتا تھا۔ ایک خط میں لکھتی ہے، میں خوش ہوں کہ اب میں خواب نہیں دیکھتی اور نہ ہی خیالوں میں سبز باغ بناتی ہوں۔ میں قریب بتیس سال کی ہو گئی ہوں لیکن ان 32 سالوں کے عوض میں نے خود کو پالیا ہے۔

1967 اس کی زندگی میں عجیب موڑ اور المناک کلائمکس لے کر آتا ہے۔ فروغ نے جارج برنارڈ شاہ کے ڈرامے سینٹ جون آف آرک میں مرکزی کردار ادا کرنے کا منصوبہ بنایا، شائد وہ خود کو ایران کی جون آف آرک تصور کر رہی تھی، فروغ کی جون کے ساتھ مماثلت بڑی حیران کن تھی۔ جون کا سب سے بڑا قصور اور گناہ یہ تھا کہ اس نے لڑائی کر کے مردانہ کپڑے پہن کر فطرت سے بغاوت کی تھی۔ پادریوں اور معاشرے کی دوسروں کی ذاتی زندگی میں مداخلت پر صدائے احتجاج بلند کیا تھا۔ لیکن تمام تیاریوں کے باوجود تقدیر کسی اور کھیل کا ارادہ کر رہی تھی، سوموار 14 فروری 1967 کا دن تھا وہ اپنی ماں سے ملاقات کے بعد گلستان اسٹوڈیو کی جانب گاڑی پر روانہ ہوئی جسے وہ خود چلا رہی تھی، ایک چوراہے پر سامنے سے آتی گاڑی سے بچنے کی کوشش میں ایک دیوار سے جا ٹکرائی اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی، روز و شب اور موت و حیات کے اس سلسلہ ہائے عمل میں نہ جانے کب سے کچھ عجیب لوگ کچھ عجیب سی داستانیں اپنے اپنے احساس لہو سے لکھ کر معدوم ہو جاتے ہیں۔ لیکن فروغ کے بارے میں بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔

جب اس کا مجموعہ اسیر شائع ہوا تھا تو بہت سے نقادوں اور قارئین کا خیال تھا کہ وہ ایرانی سوسائٹی کے اخلاق کو بگاڑ دے گی۔ خمینی کی قیادت میں جب اقتدار ملائیت کے ہاتھ آیا، تو تہران کے سب سے بڑے پبلشنگ ہاوس کے مالک کو اس جرم میں گرفتار کر لیا گیا کہ اس نے فروغ کی کتابیں شائع کی ہیں۔ فروغ نے ایک بار انٹرویو میں کہا تھا، میں جانتی ہوں کہ میں نے کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام نہیں دیا یہ صرف اس لئے محسوس کیا جاتا ہے کہ مجھ سے پہلے کسی عورت نے اپنی زنجیروں کو توڑنے کا قدم نہیں اٹھایا، میں نے پہلی دفعہ ایسا کیا ہے لہذا سارا شور شرابہ میرے حصے ہی میں آنا تھا۔ عورت کو تو محبوب بننے کا بھی حق نہ تھا، اسی لئے حافظ کی غزلوں میں محبوب عورت

نہیں مرداورلونڈے ہیں!۔فروغ کی ایک نظم اسیر پرندہ کچھ یوں ہے:

میں سوچ رہی ہوں
کہ اچانک اپنے پر پھیلا دوں
اس خاموش قید سے اڑ جاوں
اپنے صیاد پر مسکراتے ہوئے
اس کے سامنے ایک نئی زندگی کا آغاز کروں

فروغ کا خودمختار زندگی بسر کرنا ہی اپنے عہد کے دانشوروں کے لئے اسے خراب عورت سمجھنے کے لئے کافی تھا، پاکستانی نقاد پروفیسر شکور احسن کی غلاظت زدہ ذہنیت ملاحظہ فرمائیں، فروغ پر جناب انور مسعود کے مقالے پر اپنے جائزے میں لکھتے ہیں۔ اس شاعرہ نے فارسی شاعری میں قید وضبط کی روائت کو مکمل طور پر خیرباد کہا اور اپنے ہوس آمیز جنسی جذبات کو ایسے بے تکلف، بے حجاب اور لذت پرستانہ رنگ میں پیش کیا جس کی نظیر فارسی کی پوری تاریخ میں عورت تو کیا کسی مرد شاعر کے ہاں بھی نظر نہیں آتی۔فروغ کی مجنونانہ ہوس بالآخر اس کے ذہنی توازن پر بجلی بن کر گری اور اسے ایک ذہنی شفاخانہ میں پناہ لینی پڑی۔اس ذہنیت کے لوگ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پروفیسر بنے ہوئے ہیں۔

یہ سوال بڑا اہم ہے کہ کیا جنسی بے راہ روی اور تلذذ فروغ کا واقعی مسئلہ تھا۔فروغ ایک ایسی نوجوان عورت تھی جس کا مسئلہ صرف آزادی اور انسانی مقام کا حصول تھا، چونکہ پدرشاہی نظام نے عورت کے استحصال میں اس کی مخصوص جنسی حثیت کو بطور ہتھکنڈا استعمال کیا ہے، چنانچہ جب بھی عورت آزادی کے لئے قدم اٹھائے گی، لامحالہ مردانہ سماج کے بنائے ہوئے جنسی ضوابط ضرور خطرے میں پڑ جائیں گے۔ جب بھی عورت اپنے سماجی حقوق اور انسانی آزادی کی بات کرتی ہے، مرد اسے جنسی آزادی کے ساتھ ملا کر پروپیگنڈا شروع کر دیتے ہیں۔جنسی ضوابط یوں بنائے گے ہیں۔جس سے مردوں کی جنسی بے راہ روی کو قانونی اور شرعی شکل مل جائے۔عورت کی آزادی اس کی کامل شخصیت میں ہوگی۔مردوں کے بنائے جنسی ضوابط اور دہرے معیار کی حامل اقدار قائم رہیں اور عورت کا باقی کا حصہ آزاد ہو جائے، عجیب منطق ہے۔مرد براہ راست نہیں کہہ سکتا کہ وہ عورت کو غلام رکھنا چاہتا ہے لہذا وہ اخلاقی اقدار کا سہارا لیتا ہے لہذا جو بھی عورت بلا سمجھوتہ اپنے

حقوق اور آزادی کا پرچم بلند کرے گی اسے آوارہ اور مغرب زدہ قرار دے کر سماج میں بیداری کے عمل کو روک دیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے، کیا جنسی احساسات ادب کا موضوع بن سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے وہی معیار سامنے رکھنا ہوگا جو ہم دیگر موضوعات کے لئے مقرر کرتے ہیں۔یعنی نفس مضمون پر جمالیاتی اور فن کارانہ اقدار غالب رہنی چاہئے، جنس جو تخلیقی عمل کا منبع ہے اور انسان کی تمام نفسیاتی، جذباتی، اعصابی اور معاشرتی دنیا پر محیط ہے اسے ادب سے کیسے خارج کیا جاسکتا ہے، مرد جتنی چاہے عشقیہ شاعری کرے، حتی کہ لونڈے بازی کو بھی ادب میں لے آئے (اقبال کا مشہور شعر۔نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں) لیکن عورت اگر جذبات کا اظہار کر دے تو قیامت برپا ہو جاتی ہے۔دراصل مردانہ جنسی ضوابط کا بنیادی اصول عورت کی مکمل مفعولیت اور اپنی ذات کے بارے عدم اظہار ہے، جنسی دنیا کے تمام حقوق بحق مرد محفوظ ہیں۔ ماں، بہن، اور بیٹی کو جنسی جذبات اور تقاضوں سے عاری سمجھا جاتا ہے۔بیوی کو بھی بے جنس Asexual متصور کر لیا جاتا ہے۔اس لئے جنسی اظہار کے لئے الگ سے طوائفیں (ماضی میں کنیزیں اور لونڈیاں) پالی جاتی ہیں۔مسئلہ فروغ کی جنسی نظمیں نہیں تھیں۔اس کا آزادی پسند، باصلاحیت اور باشعور عورت ہونا سب سے بڑا قصور تھا۔یہ بات اس دلیل سے بھی ثابت ہوتی ہے، اس طرح کی نظمیں اس کی شاعری کا انتہائی مختصر حصہ ہیں۔جب کہ شاعری کا غالب حصہ سماجی، سیاسی شعور پر مبنی ہے۔لیکن ان مرد نقادوں کی ہوس زدہ نظریں صرف تلذذ آمیز شاعری پر مرکوز رہتی ہے، جنس فروغ کی شاعری میں نہیں ان کے دماغوں میں ہے، ورنہ تیسری دنیا کے کرب کی نمائندہ نظم کیا نظر انداز کی جاسکتی ہے۔

فروغ کی ایک باکمال سماجی وسیاسی شعور کی حامل نظم:

مجھے باغیچہ پر افسوس آتا ہے
پھولوں کی کسی کو فکر نہیں
باغیچہ کے حوض کی
مچھلی کی کسی کو فکر نہیں
کوئی یہ یقین نہیں کرنا چاہتا

باغیچہ خشک ہو رہا ہے
باغیچے کے دل کو سورج کی تپش سے ورم ہو گیا ہے
باغیچے کا ذہن آہستہ آہستہ سبز یادوں سے تہی ہوتا جا رہا ہے
باغیچے کے احساسات ایک کونے میں پڑے گل سڑ رہے ہیں
ہمارا پرانا لان تنہا پڑا ہے
ہمارا باغیچہ جمائیاں لے رہا ہے
نامعلوم بادلوں کی امید میں
ہمارا حوض خالی پڑا ہے
ہمارے گھر کے برآمدے کا باغیچہ تنہا ہے
باپ کہتا ہے
اب بہت دیر ہو گئی میں کچھ نہیں کر سکتا
میں تو اپنی زندگی تمام کر چکا
میں نے جتنا وزن اٹھانا تھا اٹھا لیا
چنانچہ وہ اپنے کمرے میں صبح سے شام تک
شاہنامہ پڑھتا رہتا ہے
باپ ماں کو کہتا ہے
جہنم میں جائیں سب پرندے اور مچھلی
میں تو مر جاؤں گا، مجھے کیا فرق پڑتا ہے
کہ یہاں کوئی باغیچہ رہے یا نہ رہے
میری پنشن کی رقم ہی میرے لئے کافی ہے
ادھر ماں
اس کی تو ساری زندگی
نماز پڑھتے مصلے پر گزر گئی ہے
دوزخ کے خوف سے

ہر بات کی تہہ میں ماں ہمیشہ
گناہ کے نشان ڈھونڈتی ہے
اس کا خیال ہے
کسی پودے کا کفر
سارے باغیچے کو تباہ کر گیا ہے
ماں سارا دن نماز پڑھنے میں مشغول رہتی ہے
ماں تو فطری طور پر گناہ گار ہے
وہ پھولوں پر، مچھلی پر پھونکیں مارتی ہے
آیتیں پڑھ کر
ماں کو کسی کے آنے کا انتظار ہے
جو زمین پر اتر کر باغیچے کے گناہ معاف کر دے گا
میرا بھائی
وہ تو باغیچے کو قبرستان قرار دیتا ہے
وہ خودرو بوٹیوں کے پھیلاؤ پر ہنستا ہے
اور گنتا رہتا ہے
مری ہوئی مچھلیوں کو
میرا بھائی فلسفہ کا عادی ہے
اس کے خیال میں باغیچے کا علاج
اس کی تباہی میں مضمر ہے
وہ بے زور، افسردہ و مایوس ہو چکا ہے
جیبی تقویم اور شناختی کارڈ کے ساتھ
اپنی مایوسیوں کو اٹھائے پھرتا ہے
اور میری بہن
جو کبھی پھولوں کی دوست تھی

جو اپنا دل لے کر ان کی مہربان

رفاقت میں جا بیٹھا کرتی تھی

اس کا گھر اب شہر کے دوسرے حصے میں واقع ہے

وہ اپنے مصنوعی گھر میں

ایک مصنوعی سنہری مچھلی ہاتھ میں لئے

اپنے خاوند کی مصنوعی محبت کی حفاظت میں

مصنوعی سیب کے شجر کی شاخوں کے نیچے

مصنوعی نغمے گاتی ہے

اور بڑے حقیقی قسم کے بچے پیدا کرتی ہے

وہ جب بھی ہمارے ہاں آتی ہے

حاملہ ہوتی ہے!

ہمارا باغیچہ تنہا ہے

ہمارا باغیچہ تنہا ہے

سارا سارا دن

دروازے کی اوٹ سے آواز آتی رہتی ہے

ٹوٹنے کی دھماکوں کی

ہمارے سب ہمسائے

اپنے اپنے باغیچوں میں

پھولوں کی جگہ

بم اور مشین گنیں اگا رہے ہیں

حوض اب

بارود کے خفیہ سٹور بن چکے ہیں

اور ہماری گلی کے بچے

اپنے اپنے اسکول بیگ میں چھوٹے چھوٹے بم رکھ چکے ہیں

ہمارا باغیچہ سراسیمہ ہے

میں اکیلی ہوں

سوچتی ہوں

باغیچے کو شفاخانے میں لے جایا جا سکتا ہے

میں سوچتی ہوں

میں سوچتی ہوں

لیکن باغیچے کا دل تو دھوپ تلے

سوجتا ہی جا رہا ہے

اور رفتہ رفتہ باغیچے کا ذہن

سرسبز دنوں کی یاد سے

خالی ہو رہا ہے

شدت احساس اور شعور کی اس سطح پر پہنچی فروغ کے لئے شہوانی لذتیں کوئی معنی رکھ سکتی تھیں۔ البتہ مردوں کے واضع کردہ شرافت کے معیار اسے قبول نہ تھے۔ وہ تنہا حالت جنگ میں تھی، لڑتے لڑتے کبھی کسی کے ہاں پناہ لیتی، کبھی کسی کے ہاں، لیکن اس نے ایک بات واضح کر دی کہ شرافت، حیا، اور عصمت کے نام پر عورت کو غلام نہیں رکھا جا سکتا۔ عورت کا جسم اور روح دونوں اس کی اپنی ہیں۔ عورت اپنی ذات، انا، اور شخصیت کی حفاظت خود کر سکتی ہے، اس کی عصمت کی ٹھیکیداری مردوں کو نہیں دی جا سکتی۔ آزادیِ نسواں پر فروغ کی ایک نظم کی چند لائنیں:

یہ تمھاری ہی آغوش ہے

جس میں غرور زدہ جلالی مرد پلا ہے

وہ شخص جو تمھاری ہی تخلیق ہے

اسے ترجیح ملے اور اعلیٰ قرار پائے

شرمناک ہے

تم کیوں خاموش ہو، اپنے حقوق لے لو

اس سے

جس نے تمہیں گھر کے کونے میں بٹھا رکھا ہے

اپنی سسکیوں کو چیخ اور پکار میں بدل دو

تا کہ تمھاری زندگی آزاد ہو سکے

20 ویں صدی کے نصف کی اس باشعور شاعرہ نے بالآخر یہ بات کھل کر کہہ دی، کہ وہ سائنس کے دیئے مفہوم کائنات پر یقین رکھتی ہے، مقدس روایات سے آج کی عورت کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ جنہیں مردوں نے اپنے مفادات یں خود ہی گھڑ رکھا ہے۔ فروغ کا ایک خوبصورت شعر!

میرا سخن کسی اندھیرے کی بزدلانہ سرگوشی نہیں

میں روز روشن، کھلی کھڑکیوں اور تازہ ہواؤں کی بات کرتی ہوں

فروغ کی ایک اور شاندار نظم ہے، چابی والی گڑیا اس میں وہ بتاتی ہے کہ ہماری عورت کو کسی بھی شکل میں دیکھ لو، وہ صرف چابی دی ہوئی باتیں کرتی ہے، اس کی اپنی ذات اور سوچ کچھ نہیں۔ فروغ کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ عورت تو کیا کوئی مرد بھی اسٹیٹس کو کو توڑ نہیں سکتا جب تک دنیا کیا کہے گی کے آہنی پنجے سے آزادی حاصل نہیں کرتا۔ وہ ساری زندگی اس موقف پر قائم رہی کہ وہ صرف اپنے شعور، ضمیر اور جبلتوں کے احکامات کی اطاعت کے علاوہ کسی کی تابعداری قبول نہیں کرے گی۔

فروغ کے الفاظ

میں کیوں رکوں، کیوں

پرندے نیلگوں سمتوں کی طرف جا چکے

میں کیوں رکوں، کیوں

میرے دل کا آئین مرتب کرنا

اندھوں کی بلدیہ کا کام نہیں

من کی کومل، ذہن کی روشن اور ضمیر کی صاف ستھری ایک تنہا جوان سال عورت کے لئے ایک پوری سفاک تہذیب سے واسطہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ تخلیقی کام دراصل ایک طرح کی جدوجہد ہوتی ہے۔ اپنی ذات کو لازوال اور موت کی نفی کرنے کی کوشش۔ فروغ اپنے مجموعہ دوسرے جنم کے بعد اس دنیا سے چلی گئی۔

میری ساری ہستی ایک تاریک گیت تھی

جو تمھیں ابدی نشو و نما اور شگفتگی

کی طرف اٹھا لے جائے

وہ لوگ جو محبتوں کے درمیان جھانکتے پھرتے ہیں۔ فروغ نے انہیں ایک نظم میں کوے سے تشبیہ دی ہے جو معاشرتی رسوم اور اپنے اخلاقی نظام کو دوسروں پر زبردستی ٹھونستے ہیں، محبت کرنے والے تو آزاد اور معصوم روحوں کی حامل سفید فاختاؤں کی مانند ہیں۔

فروغ کا عشق کسی فرشتہ صفت مخلوق کا نہیں۔ ایک گوشت پوست کے بنے انسان کا عشق ہے جو حواس اور اعصاب کی نہایت پیچیدہ اور حساس دنیا کا بنا ہے اور سب سے بڑھ کر ایک عورت کا عشق ہے۔ فروغ جب خود بھی ایسے تجربے سے گزری تو اپنے احساسات کا اظہار کسی احساس گناہ اور لگی لپٹی رکھے بغیر ایک خوبصورت نظم میں یوں معصومیت سے کر گئی کہ آسمان پر اڑتی سفید فاختاؤں نے بھی انس دیا ہوگا، ملاحظہ فرمائیں اگلی پوسٹ میں فروغ کی (بدنام زمانہ) نظم گناہ۔

نظم گناہ

میں نے اک گناہ کیا لذتوں سے بھرا

اس آغوش میں جو گرم تھی اور بھڑکیلی

میں نے گناہ کیا بانہوں کے گھیرے میں

جو تپے فولاد کی مانند تھیں مائل بہ انتقام

خاموش اور تاریک خلوت میں

میں نے اس کی راز دار نگاہوں کی طرف دیکھا

سینے میں میرا دل بے صبری سے دھڑکنے لگا

اس کی طلب بھری آنکھوں کے جواب میں

خاموش اور تاریک خلوت میں

میں اس کے ایک طرف بیٹھی تھی بال بکھیرے

اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں پر جذبات انڈیل رہے تھے

میں اپنے پاگل پن کے افسوس سے بچ کر نکل گئی

میں نے قصہ محبت اس سے سرگوشی میں کہہ دیا
اے جاناں، میری زندگی، میں تمہیں چاہتی ہوں
تمہاری جان آفریں آغوش چاہتی ہوں
اے عاشق دیوانہ میرے
خواہش نے اس کی آنکھوں میں شعلہ جلا دیا
سرخ شراب پیمانے میں رقص کناں تھی
گداز بستر پر میرا تن، من
اس کے سینے پر مستانہ وار مچل رہا تھا
میں نے اک گناہ کیا لذتوں بھرا
او خدایا! کون جانتا ہے میں نے کیا کیا
اس خاموش اور تاریک خلوت میں-----------------!

(فروغ فرخ زاد)

مسئلہ کشمیر

پاکستانی بیانیہ پر تنقیدی نظر

ہماری اسٹیبلشمنٹ نے مسئلہ کشمیر کی وجہ سے پاکستان کو پرامن، مہذب، ترقی کرتے ملک سے مذہبی انتہاپسند، جنگجو، علاقائی اور بین الاقوامی نفرتوں اور دہشت گردی کا گہوارہ بنایا ہوا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے، جس نے انتہاپسندی اور جارحیت پاکستان کے خمیر میں شامل کر دی۔ 27 اکتوبر 1947 کو ہزار ہزار آدمیوں پر مشتمل دس قبائلی لشکر کشمیر میں داخل کئے گے۔ سرکاری اور قانونی لحاظ سے اس وقت تک ابھی کشمیر کی قسمت کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔ برطانیہ، انڈیا، پاکستان اور راجہ کشمیر کے درمیان ابھی مذاکرات ہونے باقی تھے۔ کشمیری قوم پرست مانتے ہیں۔ کہ راجہ کشمیر پاکستان کے ساتھ ہی الحاق کا حامی تھا۔ لیکن ریاستی خودمختاری کے ساتھ۔ غالب آبادی مسلمان تھی، اور کشمیر کی سب بڑی سرحد پاکستان کے ساتھ ہی ملتی تھی۔ لیکن پاکستان کی بانی سیاسی اور فوجی قیادت کو صبر نہ ہوا۔ پاکستان سیاسی مذاکرات اور آئینی طریقے سے حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن پاکستانی سیاسی اور فوجی قیادت نے کشمیر کو طاقت سے چھیننے کی غیر قانونی اور غیر اخلاقی راہ اپنائی۔ وہ بھی کرائے اور لوٹ مار کرنے والے قبائلی لشکروں کے ذریعے۔ اس سے بڑی غیر قانونی، غیر مہذب حرکت بین الاقوامی طور پر کونسی ہو سکتی تھی۔ یہ پاکستانی مقتدرہ کی وہ "حماقت، ہوشیار بازی" تھی۔ جو آج تک مسئلہ کشمیر کا زہر بن کر پورے خطے کی رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ جب یہاں سے پرائیویٹ قبائلی لٹیروں اور لشکروں سے حملہ کروایا گیا۔ تو مہاراجہ کشمیر نے انڈیا کو عارضی معاہدے کے تحت اپنی مدد کے لئے بلا لیا۔ بالآخر سیز فائر ہوئی، اور موجودہ کنٹرول لائن وجود میں آئی۔ اس گوریلا جنگ سے پہلے کشمیر کے سارے راستے پاکستان سے ہو کر گزرتے تھے۔ اس کی اکثریت

مسلمان آبادی پر مشتمل تھی، مہاراجہ نے آزاد اور غیر جانبدار رہنے کا اعلان کر رکھا تھا۔ اگر قبائلی لشکر اس پر حملہ آور نہ ہوتے، تو وہ امکانی طور پر بھارت کے پاؤں پر نہ گرتا۔ یعنی پاکستانی مقتدرہ کی حماقت اور عجلت کی وجہ سے کشمیر چھن گیا۔ نفرت اور بدامنی کا مستقل طوق بنا کر برصغیر کے ڈیڑھ ارب آبادی کی گردنوں میں ڈال دیا گیا۔

پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے مسئلہ کشمیر پیدا کرنے کے بعد اس کو ہندو اور ہندوستان دشمنی کی ایک مستقل وجہ بنا دیا۔ یعنی پاکستان نام کا ایک خوبصورت، شاندار جغرافیہ اور وسائل والا ملک جو ہمیں ملا۔ ہماری فوجی اور سیاسی مقتدرہ بجائے نوزائیدہ پاکستان کو ترقی اور عوام کی خوشحالی کے اقدامات کا آغاز کرتی۔ قوم کو اور ملک کی تمام توانائی، توجہ، وسائل کو کشمیر کے نام پر انڈیا دشمنی میں خرچ کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ انڈیا کے ساتھ دشمنی محض ایک چھوٹے سے خطے کی خاطر جاری نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اس میں شدت اور جذبات بھرنے کے لئے جرنلوں کو اسلامی مسالہ لگانے کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ ریاستی سرپرستی میں اسلامی انتہاپسندی اور جہادی نظریئے کو فروغ دیا گیا۔ یہ جرنیلی سوچ کی دوسری بڑی حماقت تھی۔ ابتدا میں دنیا میں کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے لحاظ سے جو تھوڑی بہت شنوائی تھی۔ جب اس میں اسلامی جہادی رنگ بھرا۔ تو عالمی منظر میں مسئلہ کشمیر ایک اسلامسٹ تحریک کے امیج کی وجہ سے اپنی عزت کھو بیٹھا۔ چنانچہ دنیا میں آج بڑی طاقتوں کا ذکر کیا، کوئی مسکین چھوٹا سا ملک بھی کشمیر موقف پر پاکستان کا ساتھ دینے کو تیار نہیں۔ جرنلوں نے تیسری خودکش حماقت یہ کی۔ پرائیویٹ اسلامی انتہاپسند لشکروں کو کشمیر کی آزادی کا ٹھیکہ دے دیا۔ تاکہ وہ کشمیر کے اندر کاروائیاں کر کے انڈیا کا خون بہا سکیں اور اس تخریبی مداخلت سے بھارتی کشمیریوں میں علیحدگی کی تحریک کو زندہ رکھا جا سکے۔ ساتھ یہ ساتھ ہمارے جرنلوں کو گاہے بگاہے کشمیر کو آزاد کرانے کا دورہ بھی پڑتا رہا۔ تاکہ ہمارے جنرل عظیم اسلامی فاتح جنگجوؤں میں اپنا نام لکھوا سکیں۔ 1965 میں انہوں نے کشمیر پر چڑھائی کی۔ جس کے نتیجے میں 65 کی تباہ کن بے نتیجہ جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ وہ وقت تھا، جب پاکستان کی معاشی نمو اس وقت جنوبی کوریا سے آگے جا رہی تھی۔ ایک بار پھر دورہ جنرل مشرف کو پڑا اور اس نے کارگل کے راستے کشمیر فتح کرنے کا احمقانہ خواب دیکھا۔ جس کے نتیجے میں پاکستان پھر ایک خوفناک بڑی جنگ کے دہانے جا کھڑا ہوا۔ سیاسی قیادت کی وجہ سے امریکہ نے ہندوستان کو پاکستان پر حملہ کرنے سے نہ روکا

مسئلہ کشمیر کے نام پر پاکستان کو پہلے جنگی جنونیت میں اور پھر مزید اس کی تقویت کے لئے مذہبی جنونیت میں مبتلا کیا۔ اب پاکستان کے عوام کو فیصلہ کرنا ہے، ہم پاکستان کی ترقی اور عوامی خوشحالی کو مسئلہ کشمیر کے لئے کب تک قربان کرتے رہیں گے۔ اگر کشمیر کی کوئی قیمت نکالی جائے۔ تو کئی کشمیروں کے برابر وہ قیمت ہم ادا کر چکے ہیں۔ لیکن اسٹیبلشمنٹ کی سرپرستی میں جہادی جنونیوں کے طاقتور گروہ (دفاع پاکستان کونسل میں شامل سب جماعتیں) کشمیر کے نام پر بھارت کے ساتھ دشمنی اور جنگ کرنے کا پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں۔ مسئلہ کشمیر کے تین حل ہو سکتے ہیں:

> ہم بزور طاقت جنگ کے ذریعے بھارت سے کشمیر آزاد کرائیں۔ جو ناممکن ہے۔ پاکستان کے کئی آرمی چیف برملا اسے تسلیم کر چکے ہیں۔ پاکستان بھارت کو شکست نہیں دے سکتا۔ لیکن اسٹیبلشمنٹ کے پروردہ جہادی دہلی کے لال قلعے پر سبز پرچم لہرانے کے خواب دکھاتے رہتے ہیں۔
>
> عالمی برادری یعنی امریکہ اور سلامتی کونسل کے مستقل اراکین پاکستان کے حق میں کوئی فیصلہ کریں۔ اس کے بارے سوچنا بھی دیوانے کا خواب ہے۔
>
> بھارت مذاکرات کے ذریعے کشمیر پاکستان کو دے دے۔ یہ اس سے بھی بڑا دیوانے کا خواب ہے۔

چوتھا کوئی حل ہو نہیں سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا، پاکستانی عوام کو ٹرک کی بتی کے پیچھے لگایا ہوا ہے۔ جو قیامت تک نہیں پکڑی جائی اور پاکستان نے برباد اور ہلکان ہوتے جانا ہے۔ پاکستان کے لئے مسئلہ کشمیر کو دنیا میں سیاسی طور پر "زندہ" رکھنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ خوامخواہ کسی عالمی فورم میں مسئلہ کشمیر کا ذکر کر دینا ثواب دارین کے لئے۔ ایک بے کار "کشمیر کمیٹی" بنائی ہوئی ہے۔ مفت کے کروڑوں روپے کا بجٹ کھانے کے لئے۔ برسلز، لندن اور امریکہ میں پروپیگنڈا کرتے رہنے کے لئے کروڑوں ڈالروں کے بجٹ پرائیجنٹ رکھے ہوئے ہیں۔ پھر مسئلہ کشمیر کو زندہ رکھنے کے لئے ہماری اسٹیبلشمنٹ کو کنٹرول لائن کو گاہے بگاہے گرم رکھنا پڑتا ہے۔ ان کو پتا ہے، اگر اس

طرح کی مصنوعی کوششیں نہ کی جائیں تو۔ مسئلہ کشمیر ہی فوت ہو جاتا ہے۔ دنیا میں اس کا نام لینے والا کوئی اور تو ہے نہیں۔

مسئلہ کشمیر کو صرف اس لئے رکھا ہوا ہے۔ کہ بھارت کے ساتھ پاکستان کے کبھی اچھے ہمسائے کے تعلقات نہ ہونے پائیں۔ پاکستانیوں کے لئے ابھی تک صاف نہیں۔ کہ مسئلہ کشمیر کفر و اسلام کا معاملہ ہے؟ کشمیریوں کے حق خود اختیاری کا یا کسی زمین کے ٹکڑے کا یا پانی کے وسائل کا؟ ہم مختلف مواقع پر مسئلہ کشمیر کو اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق مسئلہ کشمیر کو بیان کرتے رہتے ہیں۔

ہمیں کشمیریوں سے کتنی ہمدردی ہے۔

کشمیر پچھلے 66 سال سے جنگ زدہ علاقہ ہے۔ جنگ زدہ علاقہ ہونا، خوشخبری نہیں ہوتی۔ وہ مصائب زدہ علاقہ ہوتا ہے۔ لوگ مر رہے ہوتے ہیں، ان کی معاشیات تباہ ہو رہی ہوتی ہیں۔ لوگ غربت اور بے روزگاری کا شکار ہوتے ہیں۔ قید و بند سے گزرنا پڑتا ہے، خاندان برباد ہوتے ہیں۔ عورتوں کی عصمت دری ہوتی ہے۔ اور یہ سب کچھ کشمیر میں پچھلے 66 سال سے ہو رہا ہے۔ پاکستان انڈیا کے لئے شاہد یہ ایک شغل سے زیادہ کچھ نہیں۔ کشمیر جب افراتفری کا شکار ہوتا ہے، جل رہا ہوتا ہے۔ تو ہماری اسٹیبلشمنٹ کے لئے خوشی کا مقام ہوتا ہے۔ بلکہ ہم اس طرح کے مواقع پیدا کرنے میں حتی المقدور پس پردہ اپنی طرف سے کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ تا کہ مسئلہ کشمیر زندہ رہے۔ پاکستانی کشمیر بھی جنگ زدہ علاقہ ہے۔ وہ پاک فوج اور ہماری بڑی ایجنسی کے کنٹرول میں ہے۔ وہاں کوئی غیر ملکی سیاحت کے لئے نہیں جا سکتا۔ جنگ زدہ علاقوں میں ترقیاتی کام نہیں کئے جاتے۔ وہاں کوئی سرمایہ کاری نہیں ہوتی۔ وہاں کے انفراسٹرکچر کو ترقی نہیں دی جاتی۔ کیونکہ وہاں امکانی طور پر کسی وقت بھی جنگ ہو سکتی ہے۔ گویا کشمیر کے لئے پس ماندگی اس کا مقدر بنا دی گئی ہے۔ روزگار کے کبھی مواقع پیدا نہیں کئے گے۔ اسے کبھی ترقی نہیں دی گئی۔ پاکستانی کشمیریوں کی نوکریاں اور روزگار پاکستان میں ہی ہوتا ہے۔ وہاں اگر کچھ خوشحالی نظر آتی ہے، تو وہ ان کشمیریوں کی وجہ سے ہے، جو بڑی تعداد میں برطانیہ یورپ، امریکہ رہتے ہیں۔ پاکستانی کشمیر میں اسلام آباد کی کٹھ پتلی حکومت ہوتی ہے۔ اس کا نام نہاد "صدر" اور "وزیر اعظم" اسلام آباد سے ایک ٹیلی فون کی مار ہوتا ہے۔ آزاد کشمیر کی حکومت کا کام محض اپنے پروٹوکول کو انجوائے کرنا ہے۔ کشمیر کا صدر اور وزیر اعظم مظفر آباد میں کم اور اسلام آباد میں زیادہ رہتے ہیں۔ آزاد

کشمیر کی حکومتیں کرپٹ ہیں۔ آزاد کشمیر 35 لاکھ آبادی کا ملک ہے، اور اس کے وزیروں کی تعداد 26، مشیر 74 ہیں۔ اور دیگر نمائیندوں کا کوئی شمار نہیں۔ 55 ارب کے سالانہ بجٹ میں دس ارب کا ترقیاتی حصہ ہے۔ سڑکوں اور ذرائع مواصلات کا برا حال ہے۔ لوگ نوکریوں کو ترستے ہیں۔ جہادیوں کے گروپ جا بجا نظر آتے ہیں۔ مخصوص حلیئے کے ان لوگوں کا کشمیر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کشمیر کے مقامی باشندے ان سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ جو کشمیری نوجوان ان میں پھنس جاتا ہے۔ اس کا خاندان برباد ہو جاتا ہے۔

کشمیریوں کو اگر چوائس دی جائے تو وہ آزاد خود مختار کشمیر کے حامی ہونگے۔ جو پاکستان کو ہرگز قبول نہیں۔ ہماری سیکورٹی اسٹیبلشمنٹ نے قوم پرست کشمیریوں کی تحریک کو کچل دیا۔ ہر اس کو اٹھا لیا جاتا ہے جو خود مختار کشمیر کی بات کرے۔ جہاد کشمیر کا ٹھیکہ مرید کے کے دیو بند وہابی ملاوں کے پاس ہے۔ جنہوں نے جہاد کشمیر کے لئے پوری پنجاب میں گلی گلی ٹریننگ اور بھرتی سنٹر کھول دیئے تھے۔ یہ پاکستان اور کشمیری عوام سب کے ساتھ ظلم ہے۔ کشمیر تماشہ بند ہونا چاہئے۔ جس کا مالی اور سیاسی فائدہ صرف چند گروہوں کو مل رہا ہے اور نتیجہ سوائے اس خطے کے امن اور ترقی کی بربادی کے کچھ نہیں۔

ہماری سیکورٹی اسٹیبلشمنٹ کے ہیروز

شہاب الدین غوری:

اسلامسٹوں کے صدقے جایئے، غزنوی بھی اسلام کا شیدائی اور مجاہد تھا اور غزنویوں کا قاتل ان کی حکمرانی کا تختہ الٹنے والا شہاب الدین غوری بھی مجاہدِ اسلام تھا۔ حالانکہ ان لٹیروں کا کوئی دین ایمان نہ تھا۔ سوائے تخت اور مال وزر کے۔ جو ان کے سامنے آتا، یہ اس کا نہائت بے دردی سے صفایا کر دیتے۔ اپنا خون یا غیر خون، مسلم یا کافر۔ اس میں کوئی تمیز نہ تھی۔ غوریوں اور غزنویوں میں سفاکانہ دشمنی چلی آ رہی تھی۔ غزنویوں کو ڈیڑھ سو سال ہو گے تھے حکمرانی کرتے۔ شہاب الدین غوری نے لاہور کو غزنوی حکمران خسرو ملک سے چھینا۔ اس سے قبل غوری کے دو چچاؤں کو غزنوی قتل کر چکے تھے۔ غوری کے تیسرے چچا علاوالدین نے غزنی کو فتح کر کے اور پورے شہر کو آگ لگا کر بدلا لیا۔ اس بعد آبادی کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ غزنوی خاندان کی قبریں کھدا کر ان کی ہڈیوں کو آگ لگا دی۔ سات دن اور سات راتیں غزنی آگ کے شعلوں میں جلتا رہا۔ عورتوں مردوں کو تہ تیغ کیا، عورتوں بچوں کو اٹھا لیا۔ غزنوی بادشاہوں کے محلات میں علاوالدین نے ایک ہفتہ شراب نوشی اور عیاشی کی۔ اپنے بھائی کے قتل کے بدلے میں غزنی سے سید اٹھائے گے۔ ان کو ایک پل پر لٹکا دیا۔ ان کی گردنوں میں مٹی کے تھیلے باندھ دیئے۔ لاہور آنے تک پہلے ملتان اور اوچ شریف پر قبضہ کیا۔ اوچ کا ہندو راجہ تھا۔ جب کے لاہور میں غزنویں کا آخری چشم و چراغ خسرو جو راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ اسے گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خسرو نے غوریوں کے مقابلے کے لئے سیالکوٹ میں گکھڑوں اور ہندووں سے اتحاد کیا ہوا تھا۔ جب کہ غوری کا جموں کے ہندو راجوں سے اتحاد تھا۔ گویا غزنویوں اور غوریوں کی

مہم جوئیوں کو کسی طرح بھی تبلیغ اسلام سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ غوری نے 1191 میں دہلی پر حملہ کیا، یہ ایک اتفاق تھا، کہ غوری کا مقابلہ دہلی کے ہندو راجہ پرتھوی چوہان سے ہوا۔ اگر اس وقت دہلی کا حکمران مسلمان بھی ہوتا۔ تو غوری کشور کشائی اور مال غنیمت کے لئے اس کے ساتھ لڑ رہا ہوتا۔ لہٰذا غوری کی اس جنگ کو اسلامی مقصد کی خاطر قرار دینا خلاف حقیقت ہے۔ پرتھوی چوہان نے غوری کی افغان فوج کو بری شکست سے دوچار کیا۔ غوری بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگا۔ دہلی پر فتح اس طرح ہوئی، کہ والئی قنوج جے چند کی بیٹی سے پرتھوی راج پیار کرتا تھا۔ جے چند نے بیٹی کے دلہا کے چناو کے لئے سوئمبر کی تقریب کا انعقاد کیا۔ جے چند نے پرتھوی راج کو بطور دربان آنے کی دعوت دی، جسے پرتھوری راج نے اپنے وقار کے منافی سمجھا۔ چنانچہ آنے سے انکار کر دیا۔ سب امیدوار قطار میں کھڑے تھے، جب کہ جے چند نے پرتھوی راج کا ایک بت بنا کر آخر میں کھڑا کر دیا۔ جے چند کی بیٹی نے پرتھوی راج کے بت پر پھولوں کی مالا ڈال دی۔ پرتھوی بھیس بدل کر اپنے کچھ سپائیوں کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ پرتھوی تیزی سے منڈپ کی طرف گھسا، جے چند کی بیٹی کا ہاتھ پکڑ گھوڑے پر سوار بھاگ نکلا۔ اسی غصے میں جے چند نے غوری کو دہلی پر حملے کی دعوت تھی۔ چنانچہ ڈیڑھ لاکھ افغانی گھوڑے پر مشتمل فوج نے دہلی پر حملہ کیا۔ پرتھوی راج کی مدد کے لئے جے چند اور دیگر راجہ نہ آئے۔ چوہان فوج کو شکست ہوئی، پرتھوی راج مارا گیا۔ اس کی رانی نے (جے چند کی بیٹی) چتا میں جل کر خودکشی کرلی۔ مورخ فرشتہ کے مطابق غوری نے بنارس فتح کرنے کے بعد ایک ہزار مندروں کو مسمار کیا۔ تاکہ اپنی مسلم فوج کے لئے مکانات تعمیر کئے جا سکیں۔ کیا دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنا شعار اسلامی ہے؟ وسط ایشیا کے کلچر کا حصہ تھا۔ شہروں کو آگ لگانی، عمارتوں کو مسمار کرنا۔ آبادی کو تہ تیغ کرنا۔ بابر نے جب لاہور کو فتح کیا تھا۔ تو اس نے بھی مسجدوں مندروں کا لحاظ کئے بغیر شہر کو آگ لگائی تھی۔ آگ سے آرٹ اور فن کے بیش قیمت نمونے جلا دیئے جاتے۔ آبادی کی بھلائی کی سہولتیں برباد کر دی جاتی۔ شہروں کو کھنڈر بنا دیا جاتا۔ پچھلے تیس چالیس سال کی تاریخ دیکھ لیں۔ افغانیوں نے اپنے ہی ملک کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا۔ وحشیانہ کارروائیاں، بستیوں کو روندتے نکل جانا۔ تاریخی روایات ہیں۔ مقصد تھا، حریف پر دہشت طاری کر دی جائے۔ اور وہ مقابلے بغیر ہتھیار ڈال دے۔ حملہ آور کے مطالبات کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ ہندوستان کی آخری مہم کے بعد غوری پنجاب کے

راستے اپنے وطن جارہا تھا۔ کہ راستے میں ایک خیمے میں سوتے ہوئے گکھڑ قبیلے کے لوگوں نے اسے قتل کردیا۔ ہندوستان کا پہلا حقیقی فاتح غوری کو ہی قرار دیا جاتا ہے۔

محمود غزنوی (997تا1030):

غزنی افغانستان کا ایک بڑا شہر تھا۔ محمود غزنوی نے نوجوانی میں سن رکھا تھا، کہ ہندوستان زرخیز اور مال ودولت والا ملک ہے۔

اس کے باپ نے بھی ہندوستان پر حملے کیئے ہوئے تھے۔ تیس برس کی عمر میں محمود تخت پر بیٹھا۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر 17بار حملے کیئے۔ (ابدالی نے 9بار حملہ کیا تھا) اس نے پہلے حملے میں راجہ جے پال کو شکست دی، جس نے شرم اور رنج کے مارے خود کو زندہ چتا میں جلا ڈالا۔ محمود غزنوی نے کرنگر کوٹ کے مندر کو لوٹا۔ جہاں چاندی، سونے، جواہرات کے انبار پڑے تھے۔ غزنی پہنچ کر محمود نے ایک بڑی ضیافت کا اہتمام کیا اور ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کی نمائش کی۔ سرداروں اور امرا کو قیمتی تحفے دیئے۔ چنانچہ ہر سال ہندوستان پر حملہ کرنا اس کی عادت ہوگئی۔ قیمتی مال تقسیم ہونے کی وجہ سے اس کی فوج میں ہر سال اضافہ ہوجاتا تھا۔ جس میں ایرانی، ترک اور افغانی باشندے ہوتے۔ محمود نے 1024 میں آخری بار سومنات کے مندر پر حملہ کیا۔ جو بے شمار دولت کے سبب پورے ہندوستان میں مشہور تھا۔ یہاں سے واپس جانے کے کچھ عرصہ بعد غزنوی فوت ہوگیا۔ یہ خود ہندوستان میں کبھی نہ ٹھہرا۔ البتہ لاہور میں اپنے سپہ سالار کو گورنر بنا کر چھوڑ جاتا۔ محمود کے جانشینوں نے پنجاب سے لے کر گنگا کے میدانوں تک بڑے بڑے شہروں کو فتح کیا۔ لیکن ان کے دارالخلافے غزنی اور لاہور ہی ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے، کہ وہ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ ظالم اور بے رحم نہ تھا۔ سلطنت افغانستان کا انتظام خوبی کے ساتھ کیا۔ محمود کا قصہ مشہور ہے، اس نے فردوسی کو شاہنامہ لکھنے کی فرمائش کی اور صلے میں فی شعر ایک اشرفی دینے کا وعدہ کیا۔ تیس برس کی محنت کے بعد فردوسی ساٹھ ہزار شعر لکھ کر لایا۔ محمود غزنوی ساٹھ ہزار سونے کی اشرفیاں دینے سے ہچکچایا۔ اور اس کے بدلے چاندی کے دینار دینے کو کہا۔ جسے فردوسی نے لینے سے انکار کردیا۔ اور واپس ایران چلا گیا۔ کچھ عرصے بعد محمود اپنی غلطی پر پشیمان ہوا اور ساٹھ ہزار سونے کی اشرفیاں قاصد کو دے کر ایران بھیجا۔ کہتے ہیں، محمود کا قاصد

ساٹھ ہزار اشرفیاں لے کر شہر میں داخل ہورہا تھا۔ ادھر فردوسی کا جنازہ قبرستان کی طرف جارہا تھا۔

اقبال نے اپنے ایک شعر کے ذریعے محمود غزنوی کے ایاز نامی لونڈے سے عشق کو بھی شہرت دوام دے دی۔ (نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی۔ نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں)۔ ان حملہ آوروں کا اسلام کی تبلیغ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ انہوں نے اسلام کی خاطر یہاں کوئی واضح ٹھوس اقدامات کیئے۔ نہ کوئی تبلیغ اسلام کا محکمہ بنایا۔ نہ کوئی علمی کام کیا۔ فردوسی سے اپنی بادشاہت کی تعریفی تاریخ لکھوائی۔ اس کا معاوضہ دینے میں بھی کنجوسی کی۔ ہیروں اور جواہرات کے جو خزانے اس نے اکٹھے کیئے۔ سلطان مرتے وقت تک ان کی طرف دیکھتا رہا۔ مورخ فرشتہ لکھتا ہے، محمود غزنوی نے اپنی موت سے دو روز پہلے جواہرات اور اشرفیاں شاہی خزانے سے نکلوا کر اپنے محل میں ڈھیر کرادیں۔ رنگا رنگ قیمتی ہیروں سے باغ جنت کی طرح معلوم ہورہا تھا۔ وہ ان پر حسرت کی نظریں ڈال کر دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ اور اس خزانے سے کسی کو پھوٹی کوڑی نہ دی۔ پھر اس نے شاہی اصطبل سے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی نکلوائے۔ ان کو دیکھ کر بھی دھاڑیں مار کر روتا رہا۔

اس سے پتا چلتا ہے، کہ اسے دولت سے بے پناہ محبت تھی۔ اپنی جنگی مہموں کے لئے صرف اسلام کا نام استعمال کرتے تھے۔ ورنہ مقصد کشور کشائی اور ملک گیری ہی رہا۔ محمود غزنوی کو دلچسپی کافروں کو مسلمان کرنے سے نہیں، ان کے مال ودولت سے ہوتی تھی۔ اس نے اردگرد کے کمزور مسلمان حکمرانوں سے بھی جنگیں لڑیں۔ اور ان جنگوں میں دو طرفہ اہل اسلام کا خون بہا۔ اس نے بغداد کے عباسی خلیفہ سے بھی کئی شہر اور علاقے چھین لئے۔ جسے سارے مسلمان حکمران عالم اسلام کا خلیفہ مانتے تھے۔ بلکہ اس نے بغداد کے عالم اسلام کے دارالخلافے کو ہاتھیوں سے روند ڈالنے کی دھمکی بھی دی۔ یعنی جو حشر اس نے 'اسلام کی محبت میں سومنات کے مندر' کا کیا تھا۔ وہی حشر وہ بغداد کا بھی کرنا چاہتا تھا۔ اسے جو ٹیکس ادا نہ کرتا، ایسے ہی بہانہ ڈال کر۔ کہ تم قرامطی ہو، تم باطنی فرقے کے ہو۔ تم ہندو ہو۔ اس پر چڑھ دوڑتا تھا۔ فرشتہ کے مطابق سومنات کے مندر سے ایک سو من سونا اس کے ہاتھ لگا تھا۔ غزنوی کو پورے ہندوستان میں مٹی اور پتھر کے بنے ہوئے بت کبھی نظر نہ آئے۔ امریکی مورخ ول ڈیورانٹ لکھتا ہے۔ "ترک سپہ سالار محمود غزنوی کی شمالی افغانستان میں ایک چھوٹی، غریب ریاست تھی۔ اس کی نظریں امیر کبیر ہند پر تھیں۔ ہندوؤں کی بت پرستی کو ختم کرنے کے مقدس جذبے کی آڑ اور مال غنیمت کی کشش میں اس نے ہند پر متعدد حملے

کئے۔اس نے ہندوؤں کو قتل کر کے اوران کے صدیوں کی جمع شدہ دولت اور مال واسباب کولوٹ لیا۔ پہلے حملے کی واپسی پر اس نے جب غیر ملکی سفیروں کو بجلی کی مانند چمکتے انار کے دانوں کے حجم کے برابر ہیرے، جواہرات، یاقوت، موتی دکھا کران کو انگشت بدنداں کر دیا۔ ہر موسم سرما میں محمود ہند پر حملہ آور ہوتا۔اپنے خزانے بھرتا، فوج کو شہر میں قتل وغارت گری سے شادان کرتا اور ہر موسم بہار میں پہلے سے زیادہ دولت لوٹ کر واپس چلا جاتا۔ایک خوشحال اور مالدار شہر سومنات کو اپنا نشانہ بناتے ہوئے اس کے پچاس ہزار مکینوں کو قتل کر ڈالا، اوران کی ساری دولت سمیٹ کر غزنی لے گیا۔اس وقت شاہدوہ تاریخ کا امیر ترین حکمران بن گیا۔وہ لوگوں کو غلام بنا کر بیچنے کے لئے لے جاتا۔لیکن چند سالوں میں وہاں اتنے غلام ہو گے، کہ ان کو وہاں خریدنے والا کوئی نہ رہا۔ محمود ہر مہم پر جانے سے پہلے سجدہ ریز ہو کر اللہ سے برکت کی دعا مانگتا۔اس نے پچیس برس حکومت کی۔

خدا کے حضور سجدہ ریزی نے محمود جیسے ڈاکو کو عظیم کامیابی سے ہمکنار کیا۔

(ول ڈیورانٹ۔تاریخ ہندوستان)

ابدالی:

ہماری درسی کتابوں میں بتایا جاتا ہے، کہ ابدالی علمائے دین کی دعوت پر ہندوستان سکھوں اور مرہٹوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی امداد کے لئے آیا۔ابدالی سنی عقیدہ افغان تھا۔وہ نادر شاہ (شیعہ افغان دشمن) کا زاتی ملازم بھرتی ہوا۔ترقی پا کر درانی فوج کا سالار مقرر ہو گیا۔وہ نادر شاہ کے ہمراہ قتل وغارت کی تمام مہمات میں شریک رہا۔نادر شاہ کے قتل کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ایران پر فوج کشی کی۔جو مسلمان آبادی والا ملک تھا۔اس نے کئی ایرانی شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔تلوار اور آگ سے نیشاہ پور اور دیگر شہروں کو لوٹ کر برباد کر دیا۔مکانات مسمار کردئے، خزانوں کی تلاش میں کھدائی کی گئی۔بے شمار مال غنیمت کے ساتھ نیشاپور کے مسلمانوں کو غلام اور لونڈیاں بنا کر افغانستان لے گے ابدالی کے نزدیک مفتوحہ مسلمان ہوں، مرہٹے ہوں، سکھ ہوں۔سب برابر تھے۔وہ خود کو نادر شاہ کا وارث سمجھتا تھا۔چنانچہ مغلوں سے چھینے علاقوں کو وہ اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ہندوستان پر اس کا حملہ پنجاب کے گورنر شاہ نواز خان کی دعوت پر ہوا۔جس

میں لکھا تھا۔" آپ بادشاہ، میں وزیر اعظم" لیکن ادھر دہلی کے مغل حکمران نے شاہ نواز کو معافی دے دی، اور اسے پھر اپنے ساتھ ملالیا، لیکن تیاریاں مکمل ہونے کی وجہ سے ابدالی نے لاہور پر حملہ کر دیا۔اہل لاہور نے ابدالی کی لوٹ مار سے بچنے کے لئے بتیس لاکھ روپے کی پیش کش کی، جو ابدالی نے قبول کر لی۔لیکن اس کے باوجود اس کے فوجیوں نے لاہور کو لوٹ لیا۔شہریوں کے نذرانے، مفرور گورنر کے خزانے، شہر کے تمام گھوڑے اور اونٹ لے لئے۔جس سے ابدالی کے پانچ ہزار پیادہ فوج گھڑ سوار رجمنٹ میں تبدیل ہو گئی۔ابدالی نے ہندوستان پر پنجاب کی طرف سے پھر دوسری بار حملہ کیا۔سارا علاقہ تہس نہس کر دیا، چودہ لاکھ سالانہ کی آمدنی بطور تاوان دینے کا وعدہ کیا، دہلی پر قبضے کی جنگ میں ابدالی کو شکست ہوئی۔دونوں لشکروں کے سالار اور زیادہ تر فوجی مسلمان تھے۔دونوں جانب سے نعرہ تکبیر بلند ہو رہے تھے۔اس جنگ میں بے شمار لوگوں کی گردنیں اڑادیں۔مکانات نذر آتش کئے، اور ساز وسامان لوٹ لیا۔ابدالی کا پانی پت کی تیسری جنگ میں مقابلہ مرہٹوں سے ہوا۔اس وقت اگر حکمران مسلمان ہوتا، تو جنگ پھر مسلمانوں کے درمیان ہی ہوتی۔مرہٹوں سے لڑنے کی بجائے ابدالی مسلمانوں کا ہی گلہ کاٹ رہا ہوتا۔احمد شاہ ابدالی کے مسلسل حملوں سے سلطنت مغلیہ کمزور ہو گئی۔اور ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کی راہ ہموار ہو گئی۔

(پروفیسر عزیز الدین احمد۔پنجاب اور بیرونی حملہ آور)

حقوق انسانی اور سماجی انصاف کا تصور

سماجی انصاف اور ظلم واستحصال کی باتیں کرتے وقت ہمیں یاد رکھنا چاہئے، کہ ہم جس سلسلہ کائنات کی پیداوار اور اس کا نہائت معمولی سا جزو ہیں۔ وہ اپنے تہی اقدار سے بے نیاز ہے۔ جہاں طاقت ور کمزور کو کھا جاتا ہے۔ ساری مادی کائنات اور خاص طور پر حیاتیاتی دنیا اسی بے رحم قانون کے تحت چل رہی ہے۔ زندگی اور کائنات کا سارا سلسلہ ہماری اخلاقیات اور جذبات سے بے بہرہ ہے۔ اس پر کوئی زور نہیں۔ ہم اس کائناتی اور خاص طور پر حیاتیاتی دنیا کے بے رحم سلسلے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ چنانچہ جب انسان اس حیاتیاتی دنیا میں وجود میں آیا۔ تو جہد بقائے حیات ہی طاقت ور جبلت تھی۔ جو زیادہ ہوشیار اور ماحول کے مطابق بدلنے میں لچک رکھتا ہے۔ وہ باقی رہ جاتا ہے۔ یہ وہ اندھا، ظالمانہ فطری قانون ہے جو ہمیں فطرت سے ملتا ہے۔ مارکس نے کہا۔ کہ ہر چیز کے پیچھے اقتصادی مفادات کارفرما ہوتے ہیں۔ تو وہ بھی بقائے حیات کی اسی جنگ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ انسان کے وحشیانہ دور میں کسی کے کوئی حقوق نہیں تھے۔ نہ سماجی انصاف کا کوئی تصور۔ غلام داری دور میں طاقت ور انسان کا کمزور انسان کے ساتھ ایک بے رحم رویہ قائم رہا۔ کیونکہ بقا اور ارتقا کی ضمانت صرف اسی بے رحمانہ تعلقات میں ہی ہو سکتی تھی۔ اس وقت محاورے کے مطابق گھوڑا گھاس سے دوستی کرے گا۔ تو کھائے گا کیا۔ کا معاملہ تھا۔ جاگیرداری دور تک جب آئے۔ تو جہد بقا کی جنگ کی شدت میں کمی آچکی تھی۔ یعنی ذرائع پیداوار اس حد تک ترقی کر گئے۔ کمزوروں کو بھی کچھ حقوق دے دیئے گئے۔ اور زندہ رہنے کے کچھ بہتر حالات کار۔ انسانی سماج اور پیداواری قوتوں میں مزید ترقی ہونے پر انسانی سماج میں صنعتی زمانہ جب آیا۔ تو محنت کش طبقہ پرانے جاگیرداری دور سے مزید آزاد ہو گیا۔ اور جدید صنعتی دور میں آنے تک انسانی حقوق، فرد کے حقوق، جمہوریت۔ اظہار رائے کی آزادی۔ فرد کی آزادی۔ لیبر قوانین۔ ویلفیئر ریاستیں اور

ان کے سماجی انصاف کے قوانین۔ سب انسانوں کی برابری کم از کم نظریاتی اور اصولی طور پر تسلیم کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی سوشلزم کا نظریہ بھی پروان چڑھا۔ جو مزید غیر طبقاتی مساوات کے تصور کو لے کر آیا۔ علم، شعور، تعلیم۔ سائنس، ٹیکنالوجی کے فوائد عام آدمی کی دسترس میں آ گئے۔ انسان دو چیزوں کی جنگ لڑ رہا ہے۔ ایک طرف کائنات کا بے رحم بقائے حیات اور دوسرے انسان کے اپنے ذہن میں بنایا سماجی انصاف کا تصور۔ جو تہذیبی ارتقا کے ساتھ طاقت پکڑتا جا رہا ہے۔ انسان خود کو بنا رہا ہے۔ اپنی تشکیل آپ کر رہا ہے۔ جسے ہم انسانیت کہتے ہیں۔ نیچر نے ہم کو حیوان ہی بنایا تھا۔ ہمارا حیوانیت کا حصہ انسانیت کے دور سے بہت بڑا ہے۔ انسانی تہذیب کی مدت صرف پانچ چھ ہزار سال سے زیادہ نہیں ہے۔ جب کہ حیوانی دور لاکھوں اور کروڑوں سال کا ہے۔ ہماری نفسیات میں حیوانی دور کے کئی خوف پنہاں ہیں۔ جو ہمارے اندر عدم سلامتی اور لڑنے مرنے کی طرف لے جاتے ہیں۔ ان پانچ ہزار سال میں بھی انسان نے باہم بے شمار ظلم وستم کے ادوار گزارے۔ جو انسانی تہذیب سفر کی ارتقائی منزلیں تھی۔ اپنے اپنے زمان ومکان کی عدم مساوات بھی بے حساب موجود ہیں۔ طاقت ور طبقے ابھی بھی اپنی وراثتی طاقت کی بنا پر معاشرے کا حکمران طبقہ بنے ہیں۔ شعور اور لاشعوری طور جہد بقائے حیات کا اصول ابھی بھی پوری طاقت سے ہم پر حاوی ہے۔ ہمیں یہ بھولنا نہیں چاہئے۔ کہ سماجی انصاف کا تصور غیر فطری نظریہ ہے۔ اور یہ خالصتاً انسانی ساختہ ہے۔ چنانچہ سماجی انصاف کے تصور کے حاوی آنے میں ابھی مزید دیر لگے گی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی ایک طرف ہمیں معاشی پھیلاؤ اور عمومی خوشحالی کی طرف لے جائے گی۔ دوسری طرف انسانی شعور کی ترقی طاقتور طبقوں کو مجبور کرے گی۔ کہ اپنے استحصال میں کمی کرتے جائیں۔ مارکس بھی اس بات سے باخبر تھا۔ اسی لئے اس نے کہا تھا۔ کہ پہلے سرمایہ داری یعنی جدید صنعتی دور سے گزرنا لازمی ہوگا۔ کسی عمومی سماجی انصاف کی طرف جانے کے لئے۔ ابھی پوری دنیا ترقی یافتہ۔ کم ترقی یافتہ۔ جاگیرداری دور۔ قبائلی دور۔ وغیرہ کا مکسچر ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے۔ عاشقی صبر طلب ہے اور تمنا بے تاب۔ ہماری انا خود غرض ہے۔ اگر خود غرض نہ ہوتی تو اس کی بقا بھی ممکن نہ ہوتی۔ اگر ہر کوئی دوسرے کے لئے مرنا شروع کر دے۔ تو سب ہی مر چکے ہوتے۔ چنانچہ کچھ کو مار کے کچھ کا زندہ رہنا تھا۔ انسان اور انسان کے درمیان ابھی بے شمار قسموں کے تفاوت ہیں۔ لیکن سائنس، ٹیکنالوجی اور انسانی شعور جس سطح پر آج پہنچ گیا ہے۔ ہم امید رکھ سکتے

ہیں۔ کہ معاشی تفاوت میں مسلسل کمی آتی جائے گی۔

ہم کیوں چاہتے ہیں۔ انسانی زندگی کا مقصد اور اس کی آئیڈیالوجی الوہی آسمانی زات سے متعین ہونی چاہیئے۔ ورنہ انسان کہیں کا نہیں رہے گا۔ ہمیں فخر ہونا چاہیئے۔ کہ مقصد حیات، حق، اور انصاف کے تصورات پر ہم انسان خود قادر ہیں۔ بلکہ ہم ان تصورات کے خالق ہیں۔ ان تصورات کا کائنات میں کہیں وجود نہیں۔ فرد کا حق یا باہمی حقوق کا تناسب اور انصاف کے تصورات انسان نے اپنی تہذیبی زندگی کے ارتقا میں بنائے۔ ابتدائی وحشیانہ دور، پھر غلام داری دور، پھر جاگیردارانہ بادشاہتوں کے دور۔ اور اب جدید دنیا جو ہمارے سامنے ہے۔ اس حق و انصاف کے پیمانے، اصول، قوانین تبدیل ہوتے رہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں، کہ انسانی معاشرہ جوں جوں تہذیبی اور معاشی ترقی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ حق اور انصاف کے تصورات زیادہ واضح، زیادہ انسانی، زیادہ مہذب اور زیادہ یونیورسل ہوتے جا رہے ہیں۔ غلامی داری دور ظلم اور استحصال کے لحاظ انتہائی بے رحمانہ تھا۔ جاگیرداری دور میں اس میں قدرے کمی آئی، سرمایہ دارانہ صنعتی دور کے ابتدا میں مزدوروں کی حالت بھی نہائت ابتر اور استحصالی تھی۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے ترقی کرنے اور معاشی پھیلاو کے ساتھ اوقات کار اور حالات کار کافی بہتر ہو گے۔ سوشلسٹ نظریئے نے مساوات کے تصور کو اور زیادہ وسعت دی۔ بلکہ استحصال کے مکمل خاتمے اور بالآخر غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کی نوید بھی سنائی۔ اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ انسان بہر حال وقت کے ساتھ ساتھ اپنی کشمکش بقائے حیات کی حیوانی جبلتوں سے آزاد ہو رہا ہے۔ آج ہم ساری انسانیت میں ایک عمومی اتفاق رائے دیکھتے ہیں۔ کہ سب انسانوں کے بہر حال حقوق ہیں۔ ایک سماجی انصاف کا تصور بھی پختہ ہو رہا ہے۔ اور ظالمانہ نوعیت کا استحصال بھی آج کے دور میں عالمگیر سطح پر قابل مذمت سمجھا جاتا ہے۔

ہم مسلمانوں کی انوکھی خصوصیات

بالکل سامنے والی ننگی حقیقت سے مکر جاو:

مثلاً ہم روز دہشت گردی کے واقعات دیکھتے سنتے ہیں۔ اور اس کا ارتکاب کرنے والے مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ لیکن ہم بڑی آسانی سے جھٹلا دیتے ہیں۔ "مسلمان تو دہشت گردی کر ہی نہیں سکتا۔ اسلام تو امن کا مذہب ہے"۔ ساری دنیا اور سارے پاکستان کو پتا ہے، کہ ہمارے ہاں ایک ایسی پرائیویٹ مذہبی جہادی تنظیم ہے، جس کا کام انڈیا میں آزادی کشمیر کے نام پر جہاد کے لئے بندے بھجوانا ہے۔ ممبئی کا واقعہ ہوا، اجمل قصاب سیدھا سیدھا ثابت ہو گیا۔ پاکستانی ہے۔ ہماری ایجنسیوں، میڈیا، مذہبی حب الوطن حلقوں نے چھپانے کی کوشش کی، کہ اجمل قصاب پاکستانی نہیں۔ جسے بعد ازاں نا قابل تردید ہونے پر تسلیم کرنا پڑا۔ لیکن ہمارا یہ موقف رہا۔ کہ انڈیا کی ایجنسیوں کی ہی کارستانی ہے۔ ریاستی یا غیر ریاستی عناصر دہشت گردی کریں۔ مسلمان تنظیمیں کریں۔ سرے سے مکر جاو۔

بحث چھڑی، دوسرے مذاہب تنقید کو برداشت کر لیتے ہیں۔ مسلمان اسلام پر تنقید برداشت نہیں کرتے۔ مرنے مارنے پر فوراً ہی تل آتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر ایک نہیں سینکڑوں مثالیں ہیں، ایمان یافتہ کی طرف سے ماں بہن کی ننگی اور غلیظ گالیاں کافر، غدار، امریکی یہودی، ہندو ایجنٹ، اور مارنے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ ذرا بھر برداشت کا مادہ نہیں۔ پوسٹ میں جو لکھا ہوتا ہے، اس کا بالکل جواب نہیں دیتے۔ نہ کوئی دلیل، نہ علمی تردید۔ احمدی تو ہر کسی کو کہہ دیتے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد گالیوں کی بوچھاڑ۔ انہیں اس کا بھی کوئی احساس نہیں ہوتا۔ کہ آپ یہ کہہ کر اسلام کا دفاع کر رہے ہیں، کہ وہ سب سے اعلیٰ تہذیب یافتہ مذہب ہے۔

بلکہ یہ اپنی گندی زبان سے تصدیق کرر ہے ہوتے ہیں۔جو ان کے ناقد کہہ رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی بہت سے لوگ مکر گے، کہ نہیں، کون کہتا ہے ہم مسلمان تنقید کی اجازت نہیں دیتے۔یہ بہت بڑی تہمت ہے۔اس کا ثبوت ہے، کہ اسلام میں 72 فرقے ہیں! یہ فرقے کسی معروضی تنقید کے نتیجے میں نہیں بنے۔بلکہ یہ مذہبی دکانداریاں ہیں۔دوسرے پوری تاریخ میں آپس میں لڑتے مرتے رہے ہیں۔کہا گیا، جو آج شیعوں کو مارا جارہا ہے، یہ سیاسی اور بین الاقوامی سازش ہے، ورنہ مسلمانوں کا تو یہ پرابلم نہیں ہے۔حالانکہ یہ ننگی حقیقت ہے، کہ خلفا راشدین، علی اور عائشہ کی لڑائی سے یہ کام جاری ہے۔

سازشی تھیوری:

چونکہ ہم مسلمانوں نے اپنا دامن پاک رکھنا ہوتا ہے، اور اپنی لات اوپر رکھنی ہوتی ہے۔چنانچہ کتنا بھی کھلم کھلا سامنے کا واقعہ ہو۔صاف دکھائی رے رہا ہو، یہ حرکت اپنے ہی لوگ کر رہے ہیں۔ذمہ داری سے مبرا ہونے کے لئے کہہ دیں گے، نہیں یہ امریکہ کروا رہا ہے۔یہودی کروا رہا ہے، انڈیا کروا رہا ہے۔ساتھ ہی اگر کوئی ایسا واقعہ ہو، جس سے انڈیا، امریکہ اور اسرائیل کو نقصان ہو۔ اس پر ہم خوش بھی ہونگے۔!! اسے جائز قرار دینے کی دلیلیں دے رہیں ہونگے۔واقعہ ایک ہی وقت میں جائز بھی ہوتا ہے، اور سازش بھی ہوتی ہے۔

لاتعداد اسلامی ورژن:

یہ بھی ہمارا بڑا کمال ہے۔جو بھی اعتراض اور تنقید سامنے آئے، اگر وہ آج کے وقت اور تاریخ سے لگا نہ کھا رہا ہو، اور بچانا مشکل ہو۔اسے یہ کہہ کر رد کردو۔کہ اسلام یوں نہیں یوں کہتا ہے۔اب اس میں جتنے منہ اتنے ورژن۔کوئی کہے گا، اسلام مذہب نہیں دین ہے۔یہ سب باتیں بکواس ہیں۔کوئی یہ کہے گا، چھوڑ و حدیثوں اور روایات کو۔بس جو قرآن میں ہے، وہ اصل ہے۔ کوئی کہے گا، یہ ملاوں کی باتیں ہیں۔اسلام یہ نہیں یہ ہے۔یعنی ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔اسلام تو وہ ہے، جو سامنے ہے، جسے مولوی، علما مانتے ہیں۔جسے عام مسلمان مانتا ہے، اور جس پہ ہر روز بات ہوتی ہے۔گویا کوئی بھی اسلام پر تنقیدی معاملہ ہو۔اس کو ادھر سے

ادھر ادھر سے ادھر کردو۔یعنی گدھا کنوئیں میں ہی رہے گا۔کوئی بات حل نہ ہونے پائے۔اور نہ کسی چیز کی سمجھ آئے، کیا صحیح ہے، کیا نہیں۔لیکن لگے رہیں اسی اسلام کی طرف جو عام طور پر مروج اور مقبول ہے۔کسی کو اس کی طرف آنکھ اٹھانے کی اجازت نہ دی جائے۔خواہ وہ آج کے وقت، حالات، تقاضوں سے کتنا ہی ٹکراتا ہو۔

کچھ بھی کلئیر نہ ہونے دو۔بس الجھے رہو۔کیا صحیح ہے، کیا غلط ہے، کیا رکھنا ہے، کیا چھوڑنا ہے۔ کیا پرانا تھا، کیا نیا ہوسکتا ہے، کون سا پلندہ غیر تصدیق شدہ ہے، کونسا ابھی تک جائز اور جاری ہے۔ سب کو ایک ہی وقت میں مانا بھی جارہا ہے، اور ایک ہی وقت میں ان سے انکار بھی کیا جارہا ہے۔چنانچہ کوئی مسئلہ لے لیں۔شریعت اور اسلام کے دائرے میں جب گیا۔انشااللہ پاگل ہو جائیں گے۔کہ کیا ٹھیک ہے، کیا نہیں ہے۔اور کبھی کوئی سرا ہاتھ نہیں آئے گا۔جتنی بولیاں ہونگی، اتنی قسموں کے اسلام ہونگے۔اور جب میدان عمل ہوگا، نفاذ کا وقت ہوگا، وہاں طاقت اور تلوار فیصلہ کرے گی، کس کا اسلامی ورژن عملی طور پر چلنا ہے۔خلفا راشدین سے لے کر آج طالبان تک یہی ہوتا آیا ہے۔مسلمان آپس میں ایک دوسرے کا قتل کر کے ثابت کرتے ہیں، کس کا اسلام اصلی ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کا خصوصی مقام:

کسی دوسرے مذہب کو کوئی حق نہ دو۔لیکن اپنے لئے ہر چیز کو جائز قرار دو۔آپ غیر مسلموں کے پاس جا کر تبلیغ کر سکتے ہیں، لیکن کسی کو مسلمانوں میں تبلیغ نہ کرنے دو۔دوسرے ہر مذہب کو باطل اور کافر کہہ دو۔لیکن یہ منواو، کہ اسلام کو کوئی باطل اور کافر نہ کہے۔دوسروں کے خداوں، ان کی مقدس ہستیوں، مقدس علامتوں کو برا بھلا کہو، مذاق اڑاو۔ان کو ترمیم شدہ کہو۔لیکن جب اپنی باری ہے۔ٹوٹ کر پڑ جاو۔جب غیر مسلمان کسی اسلامی ملک میں آئیں تو وہ ہماری اسلامی ثقافت کا خیال رکھیں۔وہ اپنی طرح نہیں رہ سکتے۔لیکن جب ہم مسلمان ان کے ملکوں میں جائیں، تو ہمیں اسلامی ثقافت کے مطابق بلکہ اسلامی شریعہ کے مطابق رہنے کی اجازت دی جائے۔!!! کیونکہ ہم بہت ہی نرالے ہیں اور باقی سب ہیچ ہیں۔

زندگی کا مقصد کیا ہے؟

یہ جو لفظ مقصد یا مقصدیت ہے۔ یہ انسان کی اپنی ایجاد اور ضرورت ہے۔ ورنہ کائنات میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ یہ انسان ہے، جو ہر چیز میں مقصد دیکھنا چاہتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے وجود اور اپنے ہونے کا بھی۔ وہ جو بھی چیز دیکھتا ہے۔ کہتا ہے اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ میں اس کو کیسے استعمال اور کس طرح اپنے فائدے میں لا سکتا ہوں۔ مقصد کا تصور بھی انسانی شعور کے ارتقا کے سفر میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے لاکھوں ابتدائی سال اسی مقصد کے تصور کے بغیر ہی گزارے۔ (حیوانوں کی طرح)۔ چنانچہ مقصد کا تصور انسانی شعور کا پیدا کردہ ہے۔ میں کیا ہوں میں نے زندہ رہنا ہے تو کس لئے۔ انسان کے ہونے کے لئے ضروری ہے۔ اس کی ذات اور وجود بے کار اور فضول نہیں ہے۔

کسی پودے، حیوان، ستارے سیارے کو کوئی غرض نہیں۔ کہ اس کا کیا مقصد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ کائنات بذات خود بے مقصد ہے۔ بارش کے ہونے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ وہ اپنے قانون فطرت کے تحت پیدا ہوتی اور برستی ہے۔ اب اس سے کوئی زرخیزی کا مقصد پورا کر رہا ہے۔ کوئی نہریں، دریا، ڈیم بنا کر اس کے پانی سے "مقصد" کشید کر رہا ہے۔ یا اس سے کسی کا کچا مکان گر رہا ہے۔ بارش کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ سورج کو کچھ پتا نہیں۔ کہ اس کی روشنی سے یہاں زمین پر حیات نام کا کیا ڈرامہ رچا ہوا ہے۔ فطرت اور قدرت اندھی ہے۔ اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہ انسان کی کم نظری اور خود پسندی تھی۔ کہ اس نے سمجھا۔ "خالق" نے یہ ساری کائنات اس کی ضروریات کے لئے بنائی ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ لکھتا ہے۔ کہ اگر اسے مان بھی لیا جائے، کہ خدا نے یہ سب انسان کے لئے بنایا تھا۔ تو اس کے لئے بھی زیادہ سے زیادہ ایک کہکشاں ہی کافی تھی۔!!! اربوں کھربوں کہکشاؤں کی کوئی منطق نظر نہیں آتی۔

لہٰذا مقصدیت کا سوال انسانی ساختہ ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے، کہ مقصد انسانی زندگی کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ ہم پیدا (اندھے) قانون فطرت کے مطابق ہوتے ہیں۔ مقصد کا تعین اور عنصر پیدائش اور موت کے درمیانی وقفے کے لئے ہوتا ہے۔ یہ میں ہوں، جو اپنی زندگی کو بامقصد دیکھنا چاہتا ہے۔

سب سوال ہم انسان ہی پیدا کرتے ہیں۔ اور ان کے جواب بھی خود ہی ڈھونڈتے ہیں۔ تہذیبی علمی شعوری ارتقا کا سفر ہماری زندگی کو بامقصد بناتا چلا جاتا ہے۔ اگر مرنے کے وقت مجھے یہ احساس ہو، کہ میں نے زندگی کو بے کار نہیں گزارا۔ اپنی صلاحیتوں اور انرجی سے انسانیت، فطرت اور قدرت کے ماحول کی بہتری کے لئے کچھ نہ کچھ حصہ ڈالا ہے۔ تو انسان یقیناً کسی توہم پرستی میں پڑے بغیر اس دنیا سے اطمینان سے چلا جائے گا۔

مذہب انسانی زندگی میں کوئی مقصد پیدا نہیں کرتا۔ خوامخواہ کی توہم پرستی، احساس گناہ، اور خوف پیدا کر کے مقصد کے نام پر انسان کو ذہنی غلام بنا دیتا ہے۔

چنانچہ مقصد حیات کا تعین انسانی ساختہ ہے، جو انسان کی زندگی کے آغاز پر شروع اور اس کا اختتام آخری سانس پر ہوتا ہے۔ ہم نے اپنی زندگی کے دورانیے کو خود ہی پر معنی بنانا ہوتا ہے۔ جب ہم خود کو لامحدود کائناتی سلسلے میں دیکھتے ہیں۔ تو کائنات کا سارا سلسلہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ جس کا کوئی سر ہے نہ پاؤں۔ ایک اندھا سا سلسلہ تخلیق وفنا کا ازل سے جاری ہے۔ ازل اور ابد کے الفاظ بھی ہم نے اپنی سہولت کے لئے ایجاد کر رکھے ہیں۔ جس چیز کا نہ کوئی آغاز ہے۔ نہ انجام۔ وہ لازمی طور پر بے معنی ہے۔ جس کا ہم بہت مختصر ہی اور خفیف سا حصہ ہیں۔ ایک ایسا حصہ، کائنات کے مقابلے میں جس کی کوئی اوقات متعین کرنا۔ مضحکہ خیزی کے سوا کچھ نہیں۔

یعنی اپنی حیات کے دورانیے کا مقصد تعین کرنا اور پھر کائناتی بے سروپا نظام کے ساتھ تفہیم کی سطح پر جڑ کر زندگی گزارنا انسان کے لئے شعوری چیلنج ہے۔ مذہب اس مسئلے کے بیچ آ کر کہتا ہے۔ ساری کائنات کا سلسلہ نہ صرف بامقصد ہے۔ بلکہ وہ انسانی زندگی کے مقاصد کا بھی خود ہی تعین کر دیتا ہے۔ یہ وہ راہ تھی، جسے پرانے زمانے کے انسان نے ذہنی اور فلسفیانہ الجھن سے بچنے کے لئے اختیار کی۔ کیوں کہ اس کے سامنے اس وقت نہ صرف کائنات بلکہ خود اس کی زندگی

بھی ایک پراسرار لایعنی عمل تھا۔ وہ ابھی کائنات کی گتھیوں کو سمجھ سکتا تھا نہ اپنے حیات کے متعلق کوئی قابل عمل مقاصد متعین کرنے کی ذہنی صلاحیت رکھتا تھا۔ انسانی علم و شعور کی ارتقا کا عمل جب ایسی سطح پر پہنچا۔ اور اس کے سامنے سائنس نے نہ صرف کائنات بلکہ خود اس کی اپنے اور سماجی ترتیب کے بارے بے پناہ علم اور ہنر عطا کر دیا۔ چنانچہ جدید انسان نے کسی خود ساختہ اوہام میں زندگی گزارنے کی بجائے۔ کائنات کی بے معنویت اور اپنی زندگی کو خود ہی بامقصد بنا کر زندگی گزارنے کا اعتماد حاصل کرلیا۔ کہنا چاہئے۔ لوگ مذہب کے ساتھ اس لئے زندہ رہتے ہیں۔ کہ وہ کائنات کی بے معنویت کو برداشت کرسکتے ہیں، نہ اپنی زندگی کے خود مقاصد کا تعین کرسکتے ہیں۔

جب کہ جدید سائنسی شعور کے حامل انسان کے لئے عقائد کے مصنوعی اور پرانے زمانے کے تصوراتی نسخوں کی کوئی ضرورت نہیں۔

The absurd is born out of this confrontation between the human need and the unreasonable silence of the world. Camus.

humanity must live in a world that is and will forever be hostile or indifferent towards them. The universe will never truly care for humanity the way we seem to want it to.Sartre

کونسا والا' اسلام'

مسئلہ یہ ہے، واحد، متفق، صاف، کلیئر اسلام کی کوئی شکل (ورژن) آج دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اسلام بری طرح تقسیم ہو چکا ہے۔ بے شمار گروہ، فرقے ہی نہیں، ہر ایک مسلمان کا اپنا ہی تصور اسلام ہے۔ جو مبہم سی شکل میں اس کے ذہن میں ہے۔ چنانچہ جتنے مسلمان اتنے ہی تصور اسلام ہو چکے ہیں۔ اسلام کے نام پر کیا کرنا ہے، کیا نہیں کرنا ہے۔ کیا ہونا چاہئے، کیا نہیں ہونا چاہئے، کہاں تک ہونا چاہئے۔ پورے عالم اسلام میں کسی ایک ذرا سی بات پر اجماع اور اتفاق نہیں۔ نہ کوئی مسلمانوں کو کسی ایک تصور اسلام پر راضی کرسکتا ہے۔

کسی بھی مباحثے میں ہر کوئی اپنا ''ذاتی'' تصور اسلام لے آتا ہے۔ کسی مولانا کا ریفرنس لے آئے گا۔ کوئی اور حدیث روایت لے آئے گا۔ جو ایک دوسرے سے متضاد ہونگی۔ کسی کا دعوی ہے، صرف قرآنی ٹیکسٹ پر ہی عمل کیا جائے۔ احادیث اور روایات چھوڑ دی جائیں۔ کافر قرار پانے والے احمدی اور منکر حدیث پرویزی فکر کے لوگ اسلام کی عزت بچانے کے لئے ہر دم سرگرم نظر آتے ہیں۔ ان کے بقول عام علما دین گمراہ کن اسلام پیش کرتے ہیں۔ رائج، عملی، پبلک، شرعی اور قانونی اسلام وہ ہے۔ جو علمائے دین کا بتایا اسلام ہے۔ لیکن مروجہ اسلامی شرعی تصورات کی تردید کرنے یوں چلے آتے ہیں۔ جیسے ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہیں۔ طرح طرح کے اسلام پیش کر کے آنکھوں میں دھول جھونکتے کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ مسلمان خود کو ایک ابدی خود فریبی میں مبتلا کر چکے ہیں۔ اسلام کے عاشقو۔ پہلے کوئی ایک تصور اسلام کی واضح متفقہ شکل تو بنالو۔ انشا اللہ قیامت آجائے گی۔ ایسا نہ ہو پائے گا۔ آپ آپس میں ہی لڑتے مرتے، مناظرے کرتے رہیں گے۔ اصلی اسلام ہاتھ نہیں آئے گا۔

مطالعہ پاکستان کی کلاس اور ۶۵ کی جنگ

بزدل دشمن، رات کی تاریکی، اچانک حملہ، دشمن کے ناپاک عزائم، کفر اور اسلام کی جنگ، سیسہ پلائی دیوار، دشمن کے دانت کھٹے، بی آر بی، جلو موڑ، پٹھانکوٹ، حلواڑاہ، کھیم کرن، چونڈہ، ایم ایم عالم، عزیز بھٹی، ملکہ ترنم، ٹینکوں کی جنگ، سینوں پہ بم، سبز کپڑوں والے، غازی، شہید، شکست فاش، فتح مبین یہ ہے، وہ اصطلاحیں، جن میں پاکستانی تاریخ کے ایک بہت بڑے فوجی Misadventure کو چھپادیا جاتا ہے۔

۶۵ کی جنگ کے چند حقائق۔ جو پاکستانی نسل سے چھپائے جاتے ہیں:

- جنگ کا آغاز پاکستان نے کشمیر کے محاذ پر ۵، اگست ۶۵ سے 'آپریشن جبرالٹر' کے نام سے شروع کیا تھا، جس میں ہمارے 'روائتی' انداز کو برقرار رکھا گیا۔ یعنی اپنے پراکسی 'مجاہدوں اور آزادی پسندوں' کو آگے دھکیل کر پھر پاکستان آرمی کو پیچھے بھیجا گیا۔ یہ آپریشن اپنے مقصد یعنی کشمیر کو آزاد کرانے میں ناکام ہوگیا۔ تقریباً ۳۳۰۰۰ پاکستانی آرمی جوانوں نے اس میں حصہ لیا۔
- پاکستان نے یکم ستمبر کو ایک نیا حملہ کیا۔ جس کا Operation Grand Salam کا نام دیا گیا۔ اس کا مقصد جموں کے قریب اکھنور پر قبضہ کرنا تھا۔ پاکستان کی آرمی قبضہ نہ کرسکی، چنانچہ یہ آپریشن بھی ناکام ہوگیا۔
- انڈیا نے اس کے جواب میں بین الاقوامی سرحد پر چھ ستمبر کو پاکستان پر حملہ کیا۔ ظاہر ہے، اسے 'رات کے اندھیرے' میں حملہ نہیں کہنا چاہئے۔ پاکستانی جنرلوں کو اس کے لئے تیار ہونا اور رہنا چاہئے تھا۔ حملے عموماً 'رات کے اندھیروں' میں ہی ہوتے ہیں، خواہ کوئی بھی کرے۔

- انڈین آرمی لاہور کے ائرپورٹ کے قریب پہنچ گئی۔ پاکستان آرمی نے بی آر بی کے کچھ پل توڑ کر اور کچھ پر دفاع کر کے انڈین آرمی کو نہر کراس کر کے لاہور میں داخل ہونے سے روکا۔
- انڈیا نے ۹ ستمبر کو سیالکوٹ پر ایک بڑا حملہ کیا۔ ٹینکوں کی ایک بڑی جنگ ہوئی۔ بھارتی فوج سیالکوٹ شہر کے قریبی دیہات تک پہنچ گئی۔ اس کی توپوں کے گولے سیالکوٹ اندرون شہر کے گلی محلوں پر گرنے شروع ہوگے۔
- اس جنگ میں انڈیا کے ۳۰۰۰ فوجی کام آئے۔ اور پاکستان کی طرف سے ۳۸۰۰ شہید ہوئے۔ انڈیا کی آرمی نے پاکستانی علاقے کا ۱۸۰۰ مربع کلومیٹر پر قبضہ کیا، جب کہ پاکستانی آرمی کے پاس انڈیا کا ۵۵۰ کلومیٹر۔ انڈیا نے ہمارے لاہور اور سیالکوٹ کے زرخیز علاقوں پر قبضہ کیا، جب کہ پاکستان نے زیادہ تر بنجر سندھ کی سرحد یا پھر کشمیر کے چھمب کے کچھ علاقوں پر قبضہ کیا۔
- پاکستان کا رن آف کچھ کے علاقے میں کلیم ۹۰۰۰ مربع کلومیٹر کا تھا۔ جب کہ جنگ کے بعد پاکستان برطانیہ کی ثالثی سے صرف ۹۰۰ کلومیٹر لے کر راضی ہوگیا۔
- مذکورہ جنگ شروع ہونے سے پہلے پاکستان معاشی ترقی کر رہا تھا۔ اس کی شرح نمو دیگر ایشائی ملکوں سے اچھی تھی۔ ملک میں نئی صنعتیں لگ رہی تھی، نئی یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے بن رہی تھے۔ لیکن اس جنگ کے بعد پھر پاکستان کو سیاسی معاشی استحکام کبھی نصیب نہ ہوا۔ پاکستان زوال اور اندرونی بیرونی کشیدگیوں میں ایسا گرا۔ کہ آج تک نہ اُٹھ سکا۔ پاکستان ایک اور جنگ میں آدھا ہوگیا۔ لیکن ان جنگوں کے بعد ہماری دفاعی اسٹیبلشمنٹ کے لئے ترقی اور خوشحالی کے در کھل گے۔ انڈیا پاکستان کے درمیان نفرتوں میں اضافہ ہوا۔ پاکستان مذہبی انتہاپسندی کی طرف جاتا رہا۔ اور بالآخر دنیا بھر کے دہشت گردوں کا اڈا بن گیا۔

پاکستان اور پاکستانی عوام کا مفاد ہمسایوں کے ساتھ اچھے تعلقات میں ہے۔ پاکستان کو ترقی کے لئے امن درکار ہے۔ جنگی جنون اور نفرتوں کی پالیسی پاکستان کے مفاد میں نہیں ہے۔

آئیڈیالوجی کے مسائل

نظریہ خواہ اسلامسٹ ہو، دائیں سے ہو یا بائیں سے، نظریہ سب سے پہلے اس کے ماننے والے کو متعصب کرتا ہے۔ آپ چیزوں کو بلیک اینڈ وائٹ میں دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے، وہ جھوٹ ہے۔ ہم صداقت پر ہیں۔ دوسرے غلط ہیں۔ جب کہ تعصب سچ کو گہنا دیتا ہے۔ آپ پوری تصویر یا اس کا زیادہ سے زیادہ حصہ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ عام سی بات ہے، سچ کو معروضیت سے ہی جان سکتے ہیں۔ آئیڈیالوجی (پہلے سے ایمان شدہ نظریہ) آپ کے اندر یہ یقین پیدا کر دیتی ہے کہ آپ پیدائشی اور بنیادی طور پر ہی سچے ہیں۔ لہٰذا اب مزید کچھ اور غور کرنے کی ضرورت نہیں۔

آئیڈیالوجی نفرت پیدا کر کے تشدد پر اکساتی ہے۔ "ہمارے ساتھ، یا ہمارے دشمنوں کے ساتھ"۔ اسی لئے ہر نظریئے کے لوگ تشدد پر آمادہ ہوتے ہیں۔ تشدد ان کے لئے صالح عمل بن جاتا ہے۔ وہ اپنے سچے نظریے کے لئے دوسرے لوگوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ "دوسرا" جب ہے ہی غلط، تو پھر اس شر کو صفحۂ ہستی سے مٹانا ضروری ہے۔ تاکہ اپنے نیک یا سچے نظریئے کو دنیا میں غالب کیا جا سکے۔ یا پھر اسے بچایا جا سکے اسلام دشمنوں سے۔ یا انقلاب دشمنوں سے۔ اور جب یہ سائیکی بن جاتی ہے۔ تو پھر اس کی کوئی حدود نہیں رہتی۔

آئیڈیالوجی اانسان کو مشن دیتی ہے۔

آئیڈیالوجی ہے۔ تو پھر اس کا نفاذ بھی ضروری ہے۔ اپنے دشمنوں سے لڑنا اور جدوجہد کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ آئیڈیالوجی جہادی سائیکی پیدا کرتی ہے۔ اپنے "دشمن" کی تباہی کی خواہشات رکھو اور اسے اپنی کامیابی سمجھو۔ آئیڈیالوجی تکبر پیدا کرتی ہے۔ دوسرے سب حقیر کم عقل۔ کچھ نہیں جانتے۔

آئیڈیالوجی فرقہ پرستی اور کٹر پسندی پیدا کرتی ہے۔ ذرا سا اختلاف بھی آپ کو خود اپنے ہی ہم نظریہ لوگوں سے دور کر دیتا ہے۔ وہ کم سچ کو جانتے ہیں، پورا اور اصلی سچ کا صرف آپ کو ہی پتہ ہے۔ چنانچہ ہر نظریئے کے لوگ گروہوں اور فرقوں میں بٹ جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے خلاف "سچائی کے ٹھیکیدار" بن کر لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ آئیڈیالوجی اعتدال پسندی کا خاتمہ کرتی ہے۔ ہر آئیڈیالوجی کا سچ "خالص" ہوتا ہے۔ اس میں ملاوٹ کی اجازت نہیں۔ جب کہ کائنات کی ساری ترتیب اور کیمسٹری مختلف حقیقتوں کے ملاپ کا اظہار ہے۔ آئیڈیالوجی والے لوگ ایک دوسرے کی انتہاؤں میں رہتے ہیں۔

کسی بھی چیز کا سارا وجود دو کناروں کے درمیان ہوتا ہے۔ سچ کہیں درمیان میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ آئیڈیالوجیوں نے دنیا کو برباد کیا۔ عظیم تشدد کے واقعات رونما ہوئے۔ دائیں اور بائیں بازو میں نظریاتی مائنڈ سیٹ کی خصوصیات اور رویے ایک سے ہو جاتے ہیں۔

اسی لئے تخلیق کار، مفکر، دانشور عمومی طور پر آئیڈیالجیوں سے دور رہتے ہیں۔ وہ ساری انسانیت اور ساری کائنات کو جو لاتعداد رنگوں اور کیفیات سے رچی بسی ہے۔ ان کے ساتھ اپنے کو جوڑنے پر ترجیح دیتے ہیں۔ دانش و دانائی کا حامل شخص انتہا پسند نہیں ہو سکتا۔ جب کہ آئیڈیالوجی کا آدمی انتہا پسند ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔

مسئلہ یہ نہیں آئیڈیالوجی ہونی چاہئے یا نہیں۔ آئیڈیالوجی کے ساتھ جو مذکورہ مسائل ناگزیر طور پر جڑے ہیں۔ ان سے کیسے نبٹیں۔ آئیڈیالوجی کاپی پیسٹ کی طرح ہوتی ہے۔ جو پڑھایا گیا۔ جو سنا اور بتایا گیا۔ اسے قطعی سچ سمجھ کر ایمان لے آیا جاتا ہے۔ انسانی ذہن آسانی پسند ہے۔ اسے اپنے سوال یا مسئلہ کا فوری "حل" چاہئے ہوتا ہے۔ پیچیدگیوں میں پڑنا نہیں۔ چنانچہ عام انسان فطری طور پر آسان بات اور تیار شدہ حل کو جلد قبول کرتا ہے۔ کون لمبے چوڑے جنجھٹ میں پڑے۔ زیادہ گہری فکر کے لئے ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہین انسان آسان اور ریڈی میڈ جوابات سے مطمئن نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ چھپے خزینے نکال لاتا ہے۔ عام کارکن رائٹ کا ہو، یا لیفٹ کا۔ اس نے اپنی آئیڈیالوجی کی باتیں اپنے دماغ میں کاپی پیسٹ کی ہوتی ہیں۔ اور انہیں خلوص سے سچا مان کر چل پڑتا ہے۔ ہمارے بڑوں نے جو کام کیا ہے اور بتایا ہے۔ وہ کافی ہے اور سچا ہے۔

ایمان یافتہ شخص نے خود اپنی آزادانہ عقل سے کم ہی سوچانا ہوتا ہے۔ اور ایک بار جب آئیڈیالوجی قبول کر لی تو اس کے بعد تو سوچنے سمجھنے، پرکھنے، خود تنقیدی کا عمل ہی بیکار لگتا ہے۔ ہر آئیڈیالوجی آزاد فکر کو اپنے لئے نقصان دہ سمجھتی ہے۔ لہٰذا ذرا بھی اختلاف رائے سے فتویٰ دھر دیا جاتا ہے۔ آپ مرتد ہیں، کفار کے ایجنٹ ہیں۔ اسلام دشمن، وطن دشمن، انقلاب دشمن قرار دیے جاتے ہیں۔

آئیڈیالوجی عام طور پر پولیٹیکل ہوتی ہے۔ اسلام بھی پولیٹیکل مذہب ہے۔ غلبہ کی خواہش رکھنے والا۔ پولیٹیکل آئیڈیالوجی طاقت اور پاور چاہتی ہے۔ پاور میں مفادات کا ٹکراو ہوتا ہے۔ لہٰذا آئیڈیالوجی میں فکری اور فلسفیانہ عمل کم ہو جاتا ہے۔ ساری توجہ پاور گیم کی طرف لگ جاتی ہے۔ کون دیکھے وقت کے ساتھ آئیڈیالوجی میں تضادات یا کچھ تناقص پیدا ہو گے ہیں۔ کہ ان میں کچھ تازہ افکار بھی شامل کر لئے جائیں۔ چنانچہ آئیڈیالوجیاں فرسودہ ہو کر وقت کے ہاتھوں خود ہی دم توڑ دیتی ہیں۔

مستقبل کی تہذیبی شکل

ہمارے جیسے پس ماندہ ترقی پزیر معاشروں میں روشن خیالی کی تحریک شروع ہو چکی ہے۔ جس کا آغاز پندرھویں صدی میں یورپ میں ہوا تھا۔ بالکل ہماری طرح ان پر بھی اس وقت مذہبی فکر و نظر کا بہت گہرا اثر تھا۔ آج ہمارے ہاں لوگ جرات کے ساتھ سماج، قانون اور مذہب پر وہ سوالات اٹھا رہے ہیں۔ جن پر وہ پہلے ریاست، مذہبی راہنماؤں اور تقدیسی کتابوں کے دیے جوابوں سے مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ جستجو کی ایک نئی لہر چل پڑی ہے۔ مظاہر قدرت کو سمجھنے کی بنیاد عقیدے کی بجائے مشاہدات اور تجربات پر رکھی جانے لگی ہے۔ جدید سائنسی علوم پرانے تصورات کو توڑ رہے ہیں۔ کائنات کی تشریح اور مروجہ روحانی نظریات کا دیوالیہ پن کھل کر ننگا ہو رہا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو چلانے کے لئے صدیوں پرانے انداز اب رائج رہنے مشکل ہیں۔

کیا گلوبلائزیشن کے اس دور میں تہذیبوں کی نوعیت مقامی رہ سکتی ہے؟ کیا مذہب کو کسی تہذیب کا اصل قرار دیا جا سکتا ہے؟ عقائد انہی مادی حالات کی عکاسی کر رہے ہوتے ہیں۔ جن حالات میں انہوں نے جنم لیا تھا۔ پرانے قبائلی، جاگیرداری نظام یا خلافتیں، بادشاہتیں اس صنعتی، سائنسی، جمہوری دور میں نہیں چل سکتیں۔ پرانے طریقہ پیداوار اور پرانے پیداواری رشتے تیزی سے بدل رہے ہیں۔ آج الیکٹرانک اور سوشل میڈیا، انٹرنیٹ، اور تیز ترین ذرائع مواصلات زمین کی دوریوں کو مٹا رہے ہیں۔ ادھر کوئی نئی چیز ایجاد ہوتی ہے۔ چند دنوں بعد دنیا کے کونے کونے میں وہ بک رہی ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں برتر معیار زندگی کی حامل تہذیب کے اثرات سے نہیں بچا جا سکتا۔ اصل میں مغرب کی تہذیب اب ''مغرب'' کی نہیں رہی۔ وہ جدید صنعتی معاشرے کی تہذیب ہے۔ اب صنعت مقامی نہیں رہی۔ وہ گلوبل ہو چکی ہیں۔ لہٰذا آنے والے

ایمان یافتہ شخص نے خود اپنی آزادانہ عقل سے کم ہی سوچنا ہوتا ہے۔ اور ایک بار جب آئیڈیالوجی قبول کر لی تو اس کے بعد تو سوچنے سمجھنے، پرکھنے، خود تنقیدی کا عمل ہی بیکار لگتا ہے۔ ہر آئیڈیالوجی آزاد فکر کو اپنے لئے نقصان دہ سمجھتی ہے۔ لہٰذا ذرا بھی اختلاف رائے سے فتویٰ دھر دیا جاتا ہے۔ آپ مرتد ہیں، کفار کے ایجنٹ ہیں۔ اسلام دشمن، وطن دشمن، انقلاب دشمن قرار دے دیئے جاتے ہیں۔

آئیڈیالوجی عام طور پر پولیٹیکل ہوتی ہے۔ اسلام بھی پولیٹیکل مذہب ہے۔ غلبہ کی خواہش رکھنے والا۔ پولیٹیکل آئیڈیالوجی طاقت اور پاور چاہتی ہے۔ پاور میں مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ لہٰذا آئیڈیالوجی میں فکری اور فلسفیانہ عمل کم ہو جاتا ہے۔ ساری توجہ پاور گیم کی طرف لگ جاتی ہے۔ کون دیکھے وقت کے ساتھ آئیڈیالوجی میں تضادات یا کچھ تناقص پیدا ہو گئے ہیں۔ کہ ان میں کچھ تازہ افکار بھی شامل کر لئے جائیں۔ چنانچہ آئیڈیالوجیاں فرسودہ ہو کر وقت کے ہاتھوں خود ہی دم توڑ دیتی ہیں۔

مستقبل کی تہذیبی شکل

ہمارے جیسے پس ماندہ ترقی پزیر معاشروں میں روشن خیالی کی تحریک شروع ہو چکی ہے۔ جس کا آغاز پندرھویں صدی میں یورپ میں ہوا تھا۔ بالکل ہماری طرح ان پر بھی اس وقت مذہبی فکر و نظر کا بہت گہرا اثر تھا۔ آج ہمارے ہاں لوگ جرات کے ساتھ سماج، قانون اور مذہب پر وہ سوالات اٹھا رہے ہیں۔ جن پر وہ پہلے ریاست، مذہبی راہنماؤں اور تقدیسی کتابوں کے دیے جوابوں سے مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ جستجو کی ایک نئی لہر چل پڑی ہے۔ مظاہر قدرت کو سمجھنے کی بنیاد عقیدے کی بجائے مشاہدات اور تجربات پر رکھی جانے لگی ہے۔ جدید سائنسی علوم پرانے تصورات کو توڑ رہے ہیں۔ کائنات کی تشریح اور مروجہ روحانی نظریات کا دیوالیہ پن کھل کر ننگا ہو رہا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو چلانے کے لئے صدیوں پرانے انداز اب رائج رہنے مشکل ہیں۔

کیا گلوبلائزیشن کے اس دور میں تہذیبوں کی نوعیت مقامی رہ سکتی ہے؟ کیا مذہب کو کسی تہذیب کا اصل قرار دیا جا سکتا ہے؟ عقائد انہی مادی حالات کی عکاسی کر رہے ہوتے ہیں۔ جن حالات میں انہوں نے جنم لیا تھا۔ پرانے قبائلی، جاگیرداری نظام یا خلافتیں، بادشاہتیں اس صنعتی، سائنسی، جمہوری دور میں نہیں چل سکتیں۔ پرانے طریقہ پیداوار اور پرانے پیداواری رشتے تیزی سے بدل رہے ہیں۔ آج الیکٹرانک اور سوشل میڈیا، انٹرنیٹ، اور تیز ترین ذرائع مواصلات زمین کی دوریوں کو مٹا رہے ہیں۔ ادھر کوئی نئی چیز ایجاد ہوتی ہے۔ چند دنوں بعد دنیا کے کونے کونے میں وہ بک رہی ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں برتر معیار زندگی کی حامل تہذیب کے اثرات سے نہیں بچا جا سکتا۔ اصل میں مغرب کی تہذیب اب ''مغرب'' کی نہیں رہی۔ وہ جدید صنعتی معاشرے کی تہذیب ہے۔ اب صنعت مقامی نہیں رہی۔ وہ گلوبل ہو چکی ہیں۔ لہٰذا آنے والے

دور میں تہذیب بھی ایک ہی طرح کی ہوتی جائے گی۔ سوائے کچھ مقامی خوبصورت رنگوں کے۔ جو زندگی کو خوش رنگ کرتے ہوں۔ ہر بوسیدہ چیز کا مٹنا اس کا مقدر ہو چکا ہے۔ خواہ وہ رسم ہو، خیال ہو، نظریہ ہو۔ لباس ہو۔ ساری انسانیت بالآخر ایک عالمی تہذیبی وحدت میں ڈھل جائے گی۔ خواہ ہم اس پر کتنا ہی ناک بھوں چڑھائیں۔ ایسا ہو کر رہنا ہے۔ اور یہ ہماری زندگی کو تنگی نہیں سہولتیں اور کشادگیاں دے گی۔ یہ ممکن نہیں کہ معاشی ترقی کے ساتھ ثقافت اور تہذیب نہ بدلنی پڑے۔ دنیا میں اس کی کوئی زندہ مثال نہیں۔ چین اور جاپان اپنی روز مرہ زندگی میں مغربی تہذیب کی لپیٹ میں آ گے۔ معمولی سا اپنا رنگ بچا ہے، جو تنوع سے عبارت ہے۔ لیکن اس میں وہ کچھ نہیں ہو سکتا جو پیچھے کو کھینچے۔ ہمیں مٹ جانا ہوگا، یا پھر آگے جانا ہوگا۔ کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

الحاد پر اعتراضات

الحاد اہل ایمان کے لئے کفر تو ہے ہی، لیکن کچھ عرصے سے الحاد پر دو گروپس کی طرف سے اعتراضات اٹھ رہے ہیں۔ اور وہ سوشل میڈیا پر بڑھتے ہوئے مقبول عام الحادی طوفان سے بے زاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان میں ایک وہ ہے، جو سوشل ازم مارکسزم سے قریب ہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں۔ جو ایمان اور الحاد کے بیچ جھولا جھولتے رہتے ہیں۔ اور ان کے بیچ کوئی نکاح کروانے کی خواہش رکھتے ہیں۔

اصل میں ہم ہیں ضابطہ حیات سائیکی رکھنے والی قوم۔ مذہب بھی ہمیں ضابطہ حیات (پیکج) کے طور پر دیا جاتا ہے۔ سوشل ازم بھی ایک ضابطہ حیات ہے۔ اور الحاد و ایمان کے بیچ نکاح کے متمنی بھی ضابطہ حیات کا ہی فلسفہ رکھتے ہیں۔ سیکولرازم اور الحاد (ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں) جدید دنیا کی پیداوار ہیں۔ سیکولرازم ایک رویے اور ریاستی اصول کا نام ہے۔ یعنی ریاست کا کسی مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ریاست اور تمام شہریوں کی نظر میں سب مذاہب برابر کی عزت کے حق دار ہیں۔ عقائد اور مذہب شہری کا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ اسے جدید مہذب دنیا کا پر امن بقائے باہمی کا سماجی اصول سمجھ لیں۔ سیکولرازم یہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ انسان کے دیگر مسائل حل کرنے کا کوئی نسخہ نہیں دیتا۔ الحاد عقل اور منطقی سوچ کی پیداوار ہے، لیکن سائنس نے اسے پروان چڑھایا ہے۔ جدید سائنسی (فطری اور سماجی) علوم سے پتا چلا۔ کہ اس کائنات کو بنانے والی ماورا فطرت کوئی ذات نہیں۔ تصور خدا اور مذاہب کا بھی ارتقا اسی طرح ہوا۔ اور ان میں تبدیلیاں اسی طرح آتی رہیں۔ جیسے دیگر اشیا، فلسفے، نظریات، اقدار اور قدرتی مظاہر میں ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کے ایک وقت میں جب بکثرت دیوی دیوتا بنے۔ اور اپنے ارتقائی عمل میں وہ ایک عظیم خدا کے تصور میں ڈھل گے۔ اور پھر سائنسی علم اور کائنات کا شعور اس حد تک پہنچ گیا۔ کہ

خدا کی ہی نفی ہو گئی۔ یہ سچائی کا کڑوا گھونٹ ہے، جو انسان کو آہستہ آہستہ پینا ہے۔

پاکستان جیسے معاشرے میں الحاد کا طوفان ہمارے ہاں کی مذہبی شدت پسندی کے ردعمل کی وجہ سے بھی اٹھا ہے، ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ جب لوگوں پر زبردستی مذہب کو ٹھونسا جا رہا ہے۔ پھر سائنس کے ہی ایجاد کردہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے مواقع بھی میسر آ گئے۔ جہاں آزادانہ خیالات کا اظہار ممکن ہو گیا۔ پاکستانی معاشرے کا سب سے بڑا ڈسکورس اسلام ہے۔ کوئی بات، کوئی موضوع، کوئی واقعہ، کوئی محفل، کوئی قانون، کوئی اصول۔ اس میں اسلام ضرور وارد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے ردعمل میں پاکستانیوں کی طرف سے ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ سوشل میڈیا پر الحادی انکار اور انکارِ مذہب کا پرچار بہت شدت اور کثرت سے نظر آنے لگا ہے۔

ان مذکورہ گروپس کی فرسٹریشن یہ ہے۔ کہ یہ الحاد کو بھی "ضابطہ حیات" سمجھنے لگ گے اور جب دیکھا کہ اس میں زندگی کے دیگر مسائل کا کوئی ذکر ہے نہ کوئی حل۔ جب کہ وہ توقع کرنا ہی فضول سی بات ہے۔ جس کا جس سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ مذہب سے نکلنے کے بعد بھی ہمیں جدید دنیا اور جدید طرز حیات کی اقدار کو سمجھنا مشکل ہو رہا ہے۔ ہم صدیوں سے انتہائی پس ماندہ معاشرے کی پیداوار ہیں۔ گزارش ہے، سیکولرازم یا الحاد ہی رکھیں، جو ان کا مقام ہے۔ سماجی، معاشی، سیاسی مسائل معاشرے اور ریاست کے کیسے حل ہونے ہیں۔ ان کے بارے الگ سے سوچیں۔

مسلم دنیا میں جمہوریت کے پروان نہ چڑھنے کی وجوہات

ہم دیکھتے ہیں، مسلم دنیا میں زیادہ تر بادشاہتیں، امارتیں، فوجی اور آمرانہ حکومتیں، کمزور جمہوریتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی وجوہات، اسلامی، ثقافتی، تعلیمی، معاشی پس ماندگی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے، کہ اسلام میں ریاستی، حکومتی، آئینی ڈھانچہ کی کوئی واضح شکل موجود نہیں۔ ریاست کے خدوخال کیا ہونگے، حکمران کیسے منتخب ہونگے، یا کیسے اقتدار کی منتقلی ہوگی۔ اسلام کے سیاسی اور ریاستی نظام کے بارے میں اتنی ہی الجھنیں اور تضادات ہیں، جتنے اسلام کے نام پر کسی اور مسئلے پر۔ اسی لئے رسول پاک (ص) کی وفات کے فوری بعد خلافت (جانشینی) پر زبردست اختلافات پیدا ہو گے۔ جس میں جید صحابہ کرام ایک دوسرے کے سامنے تلواریں لے کر کھڑے ہو گے۔ روایات کے مطابق اقتدار کی رسہ کھینچی میں رسول پاک (ص) کا جنازہ بھی بروقت اور عام حالات کے تحت ادا نہ ہو سکا۔ اسلام دو بنیادوں پر زندہ ہے۔ تلخ حقائق کو چھپانے اور خوشنما بنا کر پیش کرنے میں۔ اس لئے جب بھی کسی چھوٹے یا بڑے مسئلے پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے، تو اختلافات، تضادات اور لڑائی مار کٹائی کا طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ آج کی بات نہیں۔ ٹھیک آپ (ص) کی وفات سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ اسلام کے ریاستی اور سیاسی نظام کے بارے میں بانت بانت کی باتیں کی جاتی ہیں۔ جس چیز کا وجود ہی نہیں۔ اسے دنیا کے لئے مثالی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اسلام کے چاروں بنیادی خلفا کرام مختلف انداز سے منتخب ہوئے۔ اور ایک ایسی لڑائی کا آغاز ہوا، جس پر 1400 سال گزرنے کے بعد بھی اسلامی دنیا دو بڑے حصوں میں تقسیم ہے۔ ایران ولائت کے نظام پر چل رہا ہے، اور سعودی عرب خاندانی بادشاہت پر۔ امت کے دو خلیفہ تو آج

بھی انڈر گراونڈ دعوے دار موجود ہیں۔ اسلامی سیاسی نظام کو کبھی جمہوریت کا نام دے دیا جاتا ہے۔ کہ اس میں مجلس شوری ہوتی ہے۔ ظاہر ہے، اسے جمہوریت نہیں کہا جاسکتا ہے۔ خلیفہ ہمیشہ مختار کل، آج کے معنوں میں ڈکٹیٹر ہی ہوتا تھا۔ وہی آئین، قانون، انصاف کا منبع۔ اسلام کی اٹھان ایک قبائلی ماحول میں ہوئی تھی۔ چنانچہ بیعت اور شوری قبائلی تصور ہیں۔ جو قبل از اسلام سے چلے آرہے تھے۔ اسلام کے آنے سے کچھ بھی نیا نہیں ہوا تھا۔ اسلام کی چودہ سو سال کی سیاسی تاریخ میں کبھی بھی کسی عرب اور غیر عرب خلافت یا بادشاہت میں انتقال اقتدار پرامن کسی نظام اور ضابطے کے مطابق نہیں ہوا۔ حتی کہ اپنے ہی بھائیوں، بیٹوں اور باپ کو قتل کردینا معمول کا رواج تھا۔ کہنے کو تو آپ کو اسلام کے سیاسی تصور نظام پر سینکڑوں موٹی موٹی کتابیں مل جائیں گی۔ لیکن سب خیالی پلاؤ کے سوا کچھ نہیں۔ آپ کو اس میں سے کوئی ٹھوس مواد نہیں ملے گا۔ یا جو کم از کم مسلمانوں کے ہر طبقہ فکر کو قبول ہو۔ اسلام کے نام پر کسی بھی سیاسی نظام کا ڈھانچہ متصور کرلیں۔ وہ انتہائی آمرانہ مزاج لئے ہوئے ہوگا اور اس کے بعد کچھ پتا نہ ہوگا، کہ پرامن انتقال اقتدار کیسے کرنا ہے۔ جمہوریت کا تصور جدید صنعتی معاشرے اور ترقی یافتہ تہذیب کی دین ہے۔ مسلمان ممالک اور معاشرے چونکہ عمومی طور پر غیر صنعتی، غیر ترقی یافتہ ہیں۔ یہ علم، تعلیم، صنعت، بزنس میں کمزور ہیں اور ان کے ہاں ابھی بھی زیادہ تر قبائلی اور جاگیردارانہ معاشرے اور ان کی اقدار کارفرما ہیں۔ چنانچہ جدید مسلم ذہن اسلام کے مثالی تصور ریاست کو کبھی قبائلی، کبھی جاگیرداری، اور کبھی جدید جمہوری نظام میں دیکھتا ہے۔ مسلمان ماضی کو واپس لانا چاہتے ہیں۔ ایک تو ماضی کبھی واپس نہیں آسکتا، دوسرے اس ماضی کی واضح اور شفاف شکل بھی کوئی موجود نہیں۔ چنانچہ مسلم معاشرے کبھی دائیں، کبھی بائیں، کبھی آگے کبھی پیچھے بھٹکتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں ہمیشہ فوجی آمروں نے یہ تبلیغ کی، کہ جمہوریت اسلام کے منافی ہے۔ سیاسی مولویوں کا بھی یہی کہنا ہے۔ اگرچہ وہ منافقانہ اور دوغلے پن سے کام لیتے رہتے ہیں۔ اقبال جیسے مسلم دانشور جمہوریت دشمن تھا۔ "بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے"۔ اس بچارے کو پتا نہیں تھا۔ کہ تولا کیسے جائے گا، تولنے کے معیار کیا ہونگے، تولنے کی اتھارٹی کونسی ہوگی۔ اور تولنے والوں کو کون تولے گا۔ آج جس دور میں ہم زندہ ہے، اور مستقبل قریب و بعید تک۔ جمہوریت کے علاوہ کوئی دوسرا قابل عمل اور جمہوریت سے بہتر سیاسی نظام کا تصور نہیں بن پایا۔

بعد از اسلام عورت کی حالت بہتر یا ابتر

قبل از اسلام عرب میں مختلف مذاہب تھے۔ جن میں یہودی، مسیحی، زرتشتی، بت پرست، فطرت پرست اور حنیف عقیدے کے لوگ تھے۔ یہودی، مسیحی اور زرتشتیوں میں عورت کی معاشی سرگرمیوں میں شرکت پر کوئی باقاعدہ پابندی نہ تھی۔ لیکن اس قدیم دور میں سماجی اور سیاسی ڈھانچہ ایسا تھا، جس میں عورت کا پبلک رول خاندان، گھر، قبیلے سے باہر نہ ہونے کے برابر تھا۔ مردانہ غلبے کا سماج تھا۔ اس معاشرے میں کچھ ایسی خواتین تھی، جن کی اپنی ملکیت اور کاروبار ہوا کرتے تھے۔ اسلام میں محرم کا جو تصور ہے، یہ قبل اسلام ایسا ہی تھا۔ مرد کا حق تھا، کہ اس کی ماں، بہن، بیٹی، بیوی پر نظر اور کنٹرول ہو۔ عورت مرد کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ اسلام نے بھی انہی ثقافتی، سماجی اقدار کو برقرار رکھا۔ عرب اسلامی کلچر میں نام کی بجائے کنیت/رشتے کے حوالے سے پکارا جاتا ہے۔ جس میں اس کے قبیلے، خاندان، نسل کا پتہ چلتا ہے۔ ابو فلاں، ابن فلاں، بنت فلاں، ام فلاں وغیرہ۔ یعنی فرد کی اہمیت نہ تھی۔ لہذا قبائلی، نسلی، سماجی حثیت کے حساب سے اس کے ساتھ سلوک کیا جاتا تھا۔ یہ اس قدر پختہ روائت ہے، جو آج بھی عربوں میں قائم ہے۔ عرب اسلامی کلچر میں ابھی بھی مرد ہو یا عورت، فرد کی حیثیت اپنے خاندان، نسل، قبیلے کے مقابلے میں ثانوی ہے۔ جسے ہم اسلامی کلچر کہتے ہیں، وہ صحرائے عرب کا کلچر ہے۔ قرآن پاک میں جتنی خواتین کا ذکر آیا ہے۔ اچھے یا برے الفاظ میں وہ سب قبل از اسلام کی خواتین ہیں۔ اسلام کے ابتدائی زمانے یا بعد میں جن دو چار خواتین کے حوالے دئے جاتے ہیں، وہ استثنا ہیں۔ دوسرے وہ کسی نہ کسی طاقت ور ایلیٹ کلاس کے مردوں کی قریبی رشتے دار ہیں۔ جنہیں حالات کی مجبوری نے کوئی کردار کرنے کا موقع فراہم کردیا۔ جن مقدس نسوانی ہستیوں کے نام لئے جاتے ہیں، ان کا بھی کوئی قابل ذکر ایسا رول نہ تھا، جسے نمونہ بنا کر پیش کیا جاسکے، اسلام میں زبردستی عورت کی جگہ بنانے کے لئے

اعلیٰ اشرافیہ طبقے یا خاندان کی خواتین کو بطور مثال پیش کر دیا جاتا ہے۔ اسلام کا مزاج اس نوعیت کا ہوتا، تو اس دور کے اسلامی معاشرے میں یہ معمول کی بات ہوتی۔ یہ ایسے ہی ہے، جیسے رانا لیاقت، فاطمہ جناح یا بے نظیر کا نام لے لیا جائے۔ ملک کی سربراہ بننا تو دور کی بات ابھی بھی کسی محکمہ کی سربراہ بننا عورت کے لئے مشکل کام ہوتا ہے۔ جب کہ پاکستان اپنے سماجی مزاج کے لحاظ سے کافی سیکولر اور جدید تہذیب کا رنگ رکھتا ہے۔ اسلام کے ظہور سے پہلے عورت مرد کی ملکیت تھی۔ جب چھوٹی سی بچی کو کسی بوڑھے کے نکاح میں باپ دینے کا فیصلہ کرتا تھا۔ تو اس بچی کا کوئی رول نہیں ہوتا تھا۔ اسلام نے بچوں کی شادی پر کوئی اختلاف نہیں کیا۔ اسی طرح عورت کو جنسی غلام بنانے، تحفے میں دینے اور اس کی خرید وفروخت پر اسلام کو اعتراض نہ ہوا۔ مرد رشتے داروں کو قتل کر کے اجنبی عورتوں کو مجاہدین میں تقسیم کرنے پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔ اپنی فیملی اور قبیلے سے باہر کا کوئی شخص اگر عورت کے پاس آ گیا، تو اس پر شرم وحیا کو پامال کرنے کا الزام لگ گیا۔ وہی قدیم عرب کلچر اسلامی کلچر ٹھہرا۔ مسلم معاشروں میں آج بھی یہی ہے۔ اس بدوی کلچر کے حرام وحلال کے معیاروں سے اسلام کو کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ وہی سماجی اور خاندانی روایات مقدس شریعت میں ڈھل کر امر ہو گئی۔ عورت کے سوشل کنڈکٹ کی تمام ممنوعات، سزائیں اور حدود وہی رہی، جو قبل اسلام بدوی کلچر کا حصہ تھی۔ چنانچہ شریعت قبل از اسلام دور کی ہی عکاس ہے۔ جب اسلامی معاشرے میں حرم رکھتے تھے، تو اس کا مطلب ہے۔ گھر کے پچھواڑے میں بھیڑ بکریوں کی طرح عورتوں کا باڑا تھا۔ تمام مقدس شخصیات نے متعدد نکاحی بیویاں اور بیسیوں غیر نکاحی لونڈیاں رکھیں۔ جس میں عمر کی بھی کوئی قید نہ تھی۔ اسلام میں عورت کو بطور فرد یا انسان نہیں رشتوں کے حوالے سے اہمیت دی جاتی ہے۔ تمام اسلامی لٹریچر میں ماں، بہن، بیٹی، بیوی کا ذکر ہوتا ہے۔ عورت کا بطور انسان اور فرد ذکر نہیں ہوتا۔ عام مسلمان کو گماں ہے، شائد ماں، بہن، بیٹی کے رشتے اسلام نے ہی متعارف کروائے ہیں۔ اس سے پہلے یہ رشتے یا ان کا تقدس موجود نہ تھا۔ عورت کی عزت کے تعین میں سب بڑا عنصر اس کا کنوارا ہونا تھا۔ وہ اس کے پاک باز ہونے کی نشانی تھی۔ عرب معاشرے میں کنوارہ پن پہلے بھی اور آج بھی شادی کی بنیادی شرط مانی جاتی ہے۔ مرد کے کنوارے پن کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ دوسرے عورت کی عزت کا تعین اس کے قبیلہ اور خاندان پر منحصر ہوتی تھی۔ مردوں کو نصیحت کی جاتی تھی، کہ وہ اپنے ہی قبیلہ میں شادی کریں، اسی لئے اسلام

میں کزن میرج کا رواج ہے۔ شادی دولہا اور لڑکی کے باپ کے درمیان ایک معاہداتی اگریمنٹ ہوتا تھا۔ جس میں دولہا جہیز Dowry دلہن کے باپ کو دیتا تھا۔ چونکہ لڑکی باپ یا اپنے خاندان والوں کی ملکیت ہے اور اس کے حقوق ملکیت دولہا خرید رہا ہے۔ ایک دوسری طرح کی شادی ہوتی تھی۔ جس میں عورت مرد کو پروپوز کرتی تھی، اس طرح کی شادی میں عورت کا رول اہم ہوتا تھا، وہ شادی کو توڑنے اور وراثت کا حق رکھتی تھی۔ حضرت خدیجہؓ اور رسول پاک ﷺ کی شادی ایسی ہی تھی۔ اسلام کے بعد عورت کی اس آزادی کا خاتمہ ہو گیا۔ بچیوں کے پیدا ہونے پر دفن کرنے کا اسلامی اسکالر بہت ذکر کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ میں اس کا کوئی مستند حوالہ نہیں ملتا۔ عربوں میں بچوں کو دیوی دیوتاوں پر چڑھانے کا بھی رواج نہ تھا، غلامی قبل از اسلام بھی تھی۔ مسلمانوں میں کوئی فرد یا تحریک ایسی پیدا نہ ہوئی، جس نے غلامی کے مخالفت کی ہو۔ جنگ میں قبضہ کر کے مرد وزن کو غلام بنانا خدائی اجازت Divine sanctions کے دائرے میں رکھ دیا۔ قرآن پاک نے 'دائیں ہاتھ کی کمائی عورتوں' کو حلال قرار دیا۔ دشمن کی عورتوں پر قبضہ کر کے آپس میں بانٹ لینا اور ان کے ساتھ بغیر نکاح کے سیکس جائز تھا، ان کو خریدا، فروخت، اور تحفے میں دیا جاسکتا تھا۔ ان حالات میں اسلام میں عورت کی بطور انسان کے حقوق کی بات کرنا بے کار ہے۔ اسلامی معاشرے میں عورت کا ایک نکاح پر دوسرا نکاح نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر لونڈی کی پہلے شادی ہوچکی ہے۔ تو اسے منسوخ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بچے بھی بطور غلام لے لئے جاتے تھے۔ عورت کو اگر آزاد کر بھی دیا تو اس کے بچے آزاد نہیں کئے جاتے تھے۔ کثرت زواج بھی اسلام سے پہلے موجود تھا۔ اسلام میں اسے 4 تک محدود کر دیا مساوی سلوک کی ہدائت کے ساتھ۔ مساوی یا جائز سلوک کر رہے ہیں، یا نہیں، یہ ہر کسی کے انفرادی معیار پر ہے۔ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری چوتھی لانے کا مطلب ہی غیر مساوی سلوک کی طرف جانا ہے اور پہلی کی حق تلفی ہے۔ جب ایک بیوی چھوٹی عمر کی ہے، حسین ہے، طاقت ور گھرانے کی ہے، یا ذہین ہونے کی وجہ سے چہیتی ہو جائے، تو مساواتی سلوک والی شرط کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔ جب عورت ملکیت ہی مرد کی ہے، تو پھر کون پتا کرے گا مساواتی سلوک ہو رہا ہے یا نہیں۔ اسی لئے شرعی عدالتیں کبھی بھی عورت کے ساتھ ہمدرد نہیں رہی۔ قبل اسلام میں بھی عورتیں جنگ میں مددگار کے شریک ہوتی تھی۔ ایسے واقعات ملتے ہیں، جہاں عورت طلاق کا حق اپنے پاس رکھتی تھی۔ کچھ قبائل میں

مادرسری سسٹم کے آثار بھی ملتے ہیں۔ یہ بھی غلط دعویٰ کیا جاتا ہے، عورت کو ورثے میں حق نہیں ملتا تھا۔ اس کا مرد کے مقابلے میں آدھے حصے کا رواج تھا۔ عورت کے پاس ملکیت ہوتی تھی۔ آج مسلم معاشروں میں عورت یا جوان لڑکی کو حق حاصل نہیں ہے۔ کہ وہ اپنی مرضی سے کسی سے شادی کر سکے۔ آئے دن ایسے کیسوں میں لڑکی اور لڑکے کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ بچیوں کو دفن کرنے کا معاملہ بھی بلاوجہ اچھالا جاتا ہے۔ جیسے یہ کوئی معمول کی بات تھی۔ حالانکہ کسی ایک قبیلے میں سخت مشکلات یا قحط کے زمانے میں بچی کو مارنے کے واقعات ہو جاتے تھے۔ ظاہر ہے، بیٹے کو ترجیح دے دی جاتی۔ ایسا تو آج بھی کہیں کہیں ہو جاتا ہے۔ غربت یا مشکل حالات میں بچیوں کو پہلے نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔ مزید مشکل حالات میں بچے اور بچیوں کی تمیز بھی نہیں رہتی۔ قبل از اسلام کئی واقعات میں پتا چلتا ہے، لوگوں کی 7، 6 بیٹیاں تھی۔ قبل اسلام عورت کو جنازے میں شریک ہونے کی اجازت تھی۔ لڑکیوں کی موت پر مرثیہ پڑھنے کی روایات ملتی ہیں۔ پھر ایسے واقعات ملتے ہیں، جہاں عورت کو ثالث یا جج بنا کر انصاف کرایا گیا۔ اسلام کے بعد عورت کی گواہی بھی آدھی ہو گئی۔ اس کی دلیل میں سائنسی اور نفسیاتی دلیلیں دی جاتی ہیں۔ یورپ میں عورت پر میڈیکل سائنس پڑھنے کی پابندی پر اسی طرح کی سائنسی دلیلیں دی جاتی تھی۔ زنا کے معاملے میں بھی سنگساری کی سزا مکہ کے لوگوں میں نہ تھی۔ وہ زنا کو اتنا سنگین جرم نہیں سمجھتے تھے۔ جتنا اسلام نے بنا دیا۔ اگرچہ آج مسلم معاشروں میں بچیوں کو جسمانی طور دفن نہیں کیا جاتا۔ لیکن ان کے ذہنی اور سماجی طور پر دفن کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی۔ اور یہ عمل اس وقت تیز تر ہو جاتا ہے، جب پورے کا پورا اسلام کسی جگہ نافذ کر دیا جاتا ہے۔ طالبان کا افغانستان اور داعش کا شام و عراق دیکھ لیں۔

حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ

محب وطن پاکستانی کے سرٹیفکیٹ کے لئے ضروری ہے، ہم اپنے وطن کے لئے جھوٹ بولیں۔ ہر ریاست اپنے شہریوں سے کچھ جھوٹ کہلوانا پسند کرتی ہے۔

چنانچہ ہم سب یہ اعلان کریں:

- تمام جنگیں ہم نے نہیں، انڈیا نے شروع کی تھیں۔
- ہمیں نہیں، انڈیا کو بدترین شکست ہوئی تھی۔
- ہم نے کبھی پراؤیٹ اور نان اسٹیٹ ایکٹرز کو دفاعی اور خارجہ امور کے لئے استعمال نہیں کیا۔
- پاکستان کی سرزمین کسی ہمسایہ ملک کے خلاف تخریبی مقاصد میں استعمال نہیں ہوئی۔
- ہمارے ملک سے کبھی درانداز بارڈر پار نہیں بھیجے گے۔ جس ہمسایہ ملک میں جو بھی ہو رہا ہے۔ اس میں ان کے داخلی عناصر کا ہاتھ ہے۔
- کارگل ہم نے نہیں، مجاہدین آزادی نے لڑا تھا۔
- 65 کی جنگ ایک ماہ قبل نہیں۔ 6 ستمبر کو ہی شروع ہوئی تھی۔ سوئی ہوئی قوم پر رات کے اندھیرے میں مکارانہ حملہ ہو گیا تھا۔
- اجمل قصاب بالکل پاکستانی نہیں تھا۔
- کشمیر میں ہمیشہ انڈین کشمیری خود ہی لڑے ہیں۔ پاکستان سے کبھی وہاں کوئی نہیں گیا۔
- پنجاب اور آزاد کشمیر میں کوئی انٹی انڈیا خصوصی تنظیم کا وجود نہیں رہا۔ نہ ایسے لوگوں کی کبھی ہماری ریاست نے سرپرستی کی۔
- ہم نے ہمیشہ سے انڈیا کو دل سے تسلیم کیا ہے، اس نے ہمیں کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔

اور وہی پاکستان کی بربادی کا خواہش مند رہا ہے۔ ہم کبھی اس کی بربادی کے تمنائی نہیں رہے۔

اسلام عرب امپیریل ازم کی شکل

اسلام کا جب غیر عرب اقوام میں اطلاق ہوتا ہے، وہ عملی شکل میں عرب امپیریلزم (سامراج) ہی بن جاتا ہے۔عربی زبان مقدس، عربی دیوتا/خدا (اللہ) کی پوجا، عربی زبان میں عبادت، عرب کی مقدس شخصیات کے غلام، نوکر کہلوانے میں فخر، عرب ثقافت وروایات، عرب تاریخ جنوبی ایشیا میں بسنے والوں کی تاریخ بن جاتی ہے۔عربوں کی تاریخ کے شخصی، قبائلی، خاندانی صدیوں پرانے تنازعے، آج کے دور کے جھگڑے بنا کر ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگاتے ہیں۔

جب ہم کسی دوسری خطے کا مذہب اپناتے ہیں۔تو گویا ان کو شان بخشتے ہیں، ان کی برتری کو خود پر مسلط کرتے ہیں، خود کو ان کا کمی کمین سمجھتے ہیں۔عربوں نے مدینے کی ریاست سے لے کر آج تک کبھی غیر مقامی اور غیر عرب مسلمانوں کو برابر کا درجہ نہیں دیا۔مکہ کے مہاجر اور مدینے کے انصار کے ساتھ امتیاری سلوک رہا۔قبائلی تفاخر اور خاندانی نسبت پر خلفائے راشدین سے لے کر مغل بادشاہوں تک ۔اقتدار کی حصہ داری کے جھگڑے رہے۔سید اور غیر سید کی شادی آج بھی ممنوع ہے۔سعودی اور دیگر خلیجی عرب ہم ایشیائی مسلمانوں کو کمتر دوسرے درجے کے مسلمان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔چنانچہ اسلام عملی صورت میں عرب امپریلزم کا پرتو بن جاتا ہے۔بادی نظر میں ہم عربوں کی چمچہ گیری میں فخر اور ان کو اپنے سے افضل سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

ترقی یافتہ معاشرہ بننے کے لئے تین در کھولنے پڑتے ہیں

امن: جہاں اندرونی اور بیرونی امن نہ ہو۔وہاں ترقی نہیں ہوسکتی، پاکستانی ریاست اور لوگ اپنے ہمسائیوں سے اور دنیا سے دشمنی پر خوش ہوتے ہیں۔پاکستانی فخریہ کہتے ہیں، کشمیر کا مسئلہ ہماری مرضی کے مطابق حل نہ کیا، تو ہم امن نہیں ہونے دینگے۔گویا ان کو امن سے کو دلچسپی نہیں۔

تعلیم: جس ملک کے چار کروڑ بچے کبھی سکول ہی نہ جاتے ہوں۔10 کروڑ لوگ پرائمری اور میٹرک سے کم تر کی تعلیم رکھتے ہوں۔صرف 2 فیصد یونیورسٹی گریجویٹ ہوں۔وہاں ترقی کی امید احمق کا خواب ہی ہوسکتی ہے۔

آزادی فکر وعمل: جس ملک میں آزادی فکر وعمل پر پابندیاں ہوں، وہاں ترقی کا پودا کبھی نہیں پنپ سکتا، ترقی نام ہی آزاد فضا کا ہے۔

پاکستانی عوام اور ریاست نے ترقی کی طرف کھلنے والے تینوں در سختی سے بند کر رکھے ہیں۔ پسماندگی، حسرت ویاس، لوٹ کھسوٹ اور دہشت گردی پاکستان کا مقدر رہنے والی ہے۔

اسلامی نظام نام کی چیز کیا ہوسکتی ہے؟

جس میں ساڑھے چودہ سو سال میں یہ نہیں پتا۔نماز کا صحیح طریقہ کونسا ہے۔جسے ہر روز پانچ بار ادا کرنا فرض ہے۔صحابہ نے نبی پاک کو نماز پڑھتے دیکھا۔صحابہ کو لوگوں نے نماز پڑھتے دیکھا۔ لیکن کسی کو نہیں معلوم صحیح طریقہ کونسا ہے۔جتنے فرقے اتنے ہی نماز حتی کہ وضو کے طریقے ہیں۔ مسجد کے میناروں کی شکل ہر فرقے نے الگ بنا رکھی ہے۔مدرسوں والی مسجدوں کے مینار گولیوں، میزائلوں کی شکل کے ہیں۔مذہبی سکالروں کا کہنا ہے، کہ موجودہ نماز کے طریقے حضور کے چار سو سال بعد وضع ہوئے۔نبی پاک کی ہدائت کے مطابق ایک علاقے، بستی میں صرف ایک مسجد ہوسکتی ہے۔انہوں نے تو دوسری مسجد بننے پر گرا دی تھی۔اب تو ایک محلے میں آدھی درجن اور ایک سیکٹر میں بیسوں مسجدیں ہوتی ہیں۔مسجدوں میں پہلے جوتے کی فکر لاحق تھی، اب جان کی فکر بھی ہوتی ہے۔مسلح سیکورٹی کی موجودگی میں نماز پڑھیں۔نماز کے اوقات کے علاوہ مسجد کو تالا لگ جاتا ہے اور اگر کھلی ہو، تو اس کے اندر جانے پر خوف آتا ہے۔حضرت عیسی کی پیدائش کے دن منانے والوں کو مبارک دی جائے یا نہیں۔حضور اکرم کی سالگرہ کو منایا جائے یا نہیں۔عاشورہ چہلم سارے شہر اور ملک میں دہشت کے ماحول میں منعقد ہوتا ہے۔

اس پر بھی ان کی کمی نہیں جو اسلام کے بطور سماجی اور سیاسی نظام کے نشے میں مبتلا ہیں۔ہم خودکش حماقتوں میں تو نہیں رہ رہے؟

مروت۔۔۔تکلیف دہ اقدار میں سے ایک

مغربی معاشروں نے کمال کیا ہوا ہے۔انہوں نے ماضی کی سنہری اقدار کی لاش کو وقت کے کوڑے دان میں پھینک دیا۔اور اپنی زندگی کو ہلکا پھلکا کر لیا۔خوامخواہ کے ایسے مسائل جو ہم خود ہی

پیدا کرتے ہیں۔ ان سے خود کو آزاد کرا لیا۔ ان میں سے ایک مروت نام کی چیز ہے۔ ہم مشرقی
تہذیب والے مروت میں کیسے کیسے اپنے لئے عذاب اور بے آرامیاں پیدا کر لیتے ہیں۔ جس کا
کوئی حساب نہیں۔ لیکن منہ سے کچھ نہیں بول پاتے۔ جب کہ صرف ایک دفعہ جرات کر کے جو دل
کی بات ہو، جو آپ کا ذہن کہہ رہا ہو۔ اسے بیان کرنے سے ہم خود کو فضول چکروں اور پریشان
کن صورت حال سے بچا سکتے ہیں۔ جب مروت کے نتیجے میں ملبہ خود پر گرتا اور ذہنی اذیت سے
گزرنا پڑتا ہے۔ تو پھر خود ہی پچھتاتے ہیں۔ کہ مروت میں کیوں خاموش رہے۔ پہلے ہی صاف
صاف بات کیوں نہ کہہ دی۔ اپنی ذات کی خوشی اور سکون سے جب بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اپنی
خوشی اور سکون کو لٹا کر کسی کے ساتھ رعائت کرنی غلط سماجی قدر ہے۔ لوگ آپ کو لتاڑ کر چلے جائیں
گے اور آپ بعد میں خود کو احمق قرار دیں گے۔ کہ میں نے مفت میں یہ عذاب کیوں سہا۔

ہمیں اپنے ذہنوں کو فرسودہ اقدار جس میں ایک مروت بھی ہے۔ کو اپنی زندگی سے پھینک
دینے کا ہنر اور حوصلہ پیدا کرنا چاہئے۔ زندگی ہلکی ہو جائے گی۔ مغرب کے لوگ شائستہ انداز میں
صاف گوئی سے بات کر کے خود کو خواہ مخواہ کی الجھن سے بچا لیتے ہیں۔ ہم تو مروت میں اپنا ستیاناس
کرا لیتے ہیں۔ ماڈرن سوشل رویے میں ایک دوسرے کو غیر ضروری تکلیف، غیر ضروری مداخلت،
غیر ضروری انحصار سے پرہیز کیا جاتا ہے اور دوسرا فریق بھی برا نہیں مناتا۔ ہر کوئی ایک دوسرے
کے مکاں کا احترام کرتا ہے۔ یہاں اس شعور کی شدید کمی ہے۔ جس میں سوچا جائے، کہ میں کیوں
مداخلت بجائے دوسروں کو بے سکون کر رہا ہوں۔

صارفیت

اس میں کوئی شک نہیں، سرمایہ داری نظام میں فرد/انسان کو محض صارف سمجھ لیا گیا ہے۔ اور
اسے اشتہار بازی، بڑے بڑے چمکتے دمکتے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کے ذریعے انسان کو اشیائے صرف
کے حصول کی ایک پاگلانہ دوڑ میں لگا دیا ہے۔ بے حد و حساب ورائٹی، خوبصورت پراڈکٹس، ہر روز
بدلتے ماڈل۔ لوگوں کو چیزیں خریدتے رہنے کی ہر آن ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ جب کہ خوشی چیزوں
میں نہیں ہوتی۔ جب آپ کوئی نئی چیز خواہ قیمتی کیوں نہ ہو، خریدتے ہیں۔ اس کی خوشی بس وقتی ہوتی
ہے۔ کچھ دیر بعد وہ آپ کے لئے بے معنی روٹین کی چیز ہو جاتی ہے۔ کیپٹل ازم میں ہماری ایسی

سائیکی بنائی جاتی ہے، جیسے خوشی زیادہ سے زیادہ اشیائے صرف کے حصول میں ہے۔ جب کہ کئی
سروے اور تجزیئے ہوئے ہیں۔ کہ خوشی اشیا میں نہیں کہیں اور ہے۔ سماجی دباو اور بھیڑ چال سے زیادہ
سے زیادہ اشیا خریدنے اور ان کے ماڈل ہر وقت بدلتے رہنے میں انسانوں کو مشغول کر دیا ہے۔ یہ
سرمایہ داری نظام کا منفی پہلو ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے۔ کہ سوشلسٹ معیشت ایک
دوسری انتہا پر تھی۔ سوویت یونین کا سوشلسٹ بلاک اسی وجہ سے ٹوٹا تھا۔ کہ لوگوں کو اشیائے صرف کی
قلت تھی۔ ان میں کوئی ورائیٹی اور کوالٹی نہ تھی۔ وہ بھدی اور بھاری بنائی جاتی۔ یعنی ان میں خوبصورتی
کا عنصر ناپید تھا۔ سوشل ازم میں سمجھا یہ جاتا ہے۔ کہ اشیائے صرف، صرف ضرورت کے لئے ہیں۔ ان
میں جمالیاتی پہلو کی کیا ضرورت ہے۔ مرکزی کنٹرولڈ نظام پیداوار کی وجہ سے جدت پسندی کی حوصلہ
شکنی کی جاتی۔ جس کی وجہ سے سوشلسٹ ممالک میں رہنے والے عوام سخت بے اطمینانی کا شکار ہو
گے۔ وہ سرمایہ داری نظام کی چمکتی دمکتی خوبصورت سے خوبصورت تر، کوالٹی کی اعلیٰ اشیا دیکھ کر رشک
کیا کرتے۔ چنانچہ ان دونوں نظاموں کی انتہاوں سے بچ کر کوئی درمیانی راہ نکالنی ہوگی۔ انسان
یکسانیت سے بور ہو جاتا ہے۔ اسے نت نئی چیزیں بھی چاہئیں۔ ترقی وارتقا اور جدت کے دروازے
کھلے رہنے چاہئے۔ اور انسان کو اشیائے برائے اشیا کی خریداری کے پاگلانہ دوڑ سے بھی نکالا جائے۔

پاکستان کو جن چیزوں نے برباد کیا

ملائیت: مذہبی انتہاپسندی، فرقہ وارانہ نفرت اور جہالت کو فروغ دینے میں ملائیت کا بڑا ہاتھا
ہے۔

نظریہ پاکستان: پاکستانی ریاست کو اسلام کے ساتھ نتھی کر کے پاکستانی نیشنل ازم کا رستہ
بند کر دیا۔ پاکستانی ریاست فرقہ پرست بن گئی۔ اسلام کا قلعہ قرار دے کر ساری دنیا کے
مسلمانوں کا ٹھیکہ لے لیا اور اپنا ملک برباد کر دیا۔

افغان و کشمیر مجاہدین: کشمیری مجاہدین کے نام پر عسکریت پسند اسلامی تنظیمیں بنائی۔ جن کا
کام پاکستان سے بھارتی کشمیر میں مداخلت کرنا ہوتی ہے۔ وہ جب چاہتے ہیں۔ پاکستان انڈیا
کے درمیان نفرت کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔ افغانی مجاہدیں پاکستانی ریاست نے بنوائے، وہ
پاکستان کے دشمن بن گے۔ پاکستانی طالبان اور دیگر انتہاپسند عسکری جماعتیں انہی سے پھوٹی۔

اسلامی امہ: عالم اسلام اور امت کے بے کار نعرے، جن کا دنیا میں وجود نہیں۔ عالم اسلام ٹوٹا پھوٹا، ایک دوسرے کا دشمن اور مغرب کا غلام ہے۔

انڈیا سے دشمنی: انڈیا سے دشمنی نے پاکستان سے ترقی کا عمل چھین لیا۔ پاکستان کو عوامی فلاحی ترقی کرتی ریاست کی بجائے۔ سیکورٹی ریاست بنا دیا۔ سارا بجٹ اور ساری توجہ دفاع پر مرکوز کر دی۔ علاقائی بدامنی کی وجہ سے پاکستانی ترقی کو مفلوج بنا دیا ہے۔ پاکستان کو بے کار اور تباہ کن جنگوں میں دھکیلا گیا۔ اور دس گنا بڑے ملک کے ساتھ اسلحے کی دوڑ پاکستان کا مقدر کر دی۔

پاکستان کے دوستو کو پہچانو

حب الوطنی کے نام پر پاکستان میں آج تک پاکستان کے دشمنوں کا ہی ریاستی، حکومتی اور سیاسی سطح پر راج رہا ہے۔ انہوں نے حب الوطنی اور قوم پرستی کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ جب کہ سچ یہ ہے، کہ آج پاکستان کے جتنے بھی مسائل ہیں۔ وہ انہی نام نہاد محب وطنوں کی پالیسیوں کی وجہ سے ہیں۔ اتنا زیادہ اسلام اسلام اس ملک میں کیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں عدم برداشت، عدم ترقی اور دہشت گردی سے پاکستان کو بھر دیا گیا۔ اسلام کے نام پر پاکستان میں کوئی اچھائی نہیں ہوئی۔ ہمارا کوئی اخلاقی کردار نہیں سنورا۔ نہ انفرادی، نہ سیاسی، نہ حکومتی انتظامی سطح پر۔ ہم ہر روز پہلے سے زیادہ کرپٹ، چور اور منافق بنتے چلے جا رہے ہیں۔

چنانچہ پاکستان کے اصل دوست سیکولر سوچ والے ہیں۔ یعنی سب مذاہب اور سب عقائد قابل احترام ہیں۔ ریاست کی نظر میں تمام شہری برابر ہونے چاہئے۔ پاکستان مسلم اکثریتی ملک ہے، اسلام ہمارے عوام کی غالب ثقافتی پہچان ہے۔ پاکستان کے وہ اصل اور سچے دوست ہیں۔ جو کسی ملک کے ساتھ دشمنی نہیں رکھنا چاہتے، جو امن، ترقی اور عوام کی خوشحالی کو سب سے بڑی ترجیح سمجھتے ہیں۔ ہماری فوج کا فرض پاکستان کو بیرونی اور اندرونی امن کی ضمانت مہیا کرنا ہونا چاہئے۔ نہ کہ ہم ایسی پالیسیوں پر چلیں اور ان مسائل کو اچھالیں۔ جس سے کسی کے ساتھ بھی تعلقات خراب ہوں۔ ہمیں بالکل پرامن رہ کر اگلے پچاس سال اپنی اقتصادیات ٹھیک کرنی چاہئے۔ ملک کی ترقی اور عوام کی خوشحالی کے سوا ہمارا کوئی قومی ایجنڈا اور نظریہ نہیں ہونا چاہئے۔ جتنا ہم نے "دفاع کو مضبوط" کیا ہے۔ کشمیر کا ماتم رچایا ہے، اتنا ہی پاکستان ہر سطح پر کمزور اور امن سے محروم ہوا، اب دفاع کو نہیں،

پاکستان کی معیشت کو مضبوط ہمارا نعرہ، مقصد حیات اور منزل ہونا چاہئے۔ چنانچہ جو لوگ انڈیا، امریکہ، اسرائیل کے ساتھ دشمنی اور نفرت یا اسلام کے نام پر کسی ایشو کو اچھالیں۔ سمجھیں وہ پاکستان اور اس کے عوام کے دشمن ہیں۔ وہ ورغلا رہے ہیں۔ اور پاکستان کو مزید تباہی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

پاکستان کے دشمنوں کو پہچانو

پاکستان کی محبت کا ٹھیکہ مذہبی، اسلامی، دائیں بازو کی سیاست والوں نے لئے رکھا ہے۔ ان کو ریاستی اداروں کی سرپرستی حاصل ہے۔ آئیں اس مفروضے کا قلع قمع کریں۔

پاکستان کے دشمن وہ ہیں، جو پاکستان اور انڈیا کے درمیان جنگی جنون اور کشیدہ تعلقات دیکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کے دشمن وہ ہیں، جو پاکستان کے اپنے ہمسایہ ملکوں ایران، ہندوستان، بنگلا دیش اور افغانستان سے دوستانہ تعلقات نہیں ہونے دینا چاہتے

پاکستان کے دشمن وہ ہیں، جو پاکستان کو غیرت اور غلامی کا فلسفہ دے کر ترقی یافتہ مغربی ممالک کے دشمن بنا کر اسے دنیا میں تنہا کرنا چاہتے ہیں۔

پاکستان کے دشمن وہ ہیں۔ جو پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ تا کہ پاکستان مذہبی انتہاپسندی، اسلام کے نام پر دہشت گردی، تفرقہ بازی، ملائیت، جہالت کا شکار ہو کر ٹوٹ پھوٹ جائے۔

پاکستان کے دشمن وہ ہیں۔ جنہیں پاکستان کے امن اور ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کو پاکستان کی خوشحالی کی بجائے عالم اسلام اور دنیا بھر کے مسلمانوں سے جذباتی وابستگی زیادہ اہم ہے اور وہ پاکستان کے عوام کو دوسروں کے مسائل میں ہر وقت الجھائے رکھنا چاہتے ہیں۔

اسلام دین ہے۔۔۔ مذہب نہیں

اس مقبول عام مقولے کا کوئی نظری اور عملی مطلب نہیں۔ کہا جاتا ہے۔ مذہب محض مذہبی رسومات اور عبادات کا نام ہے۔ لیکن اسلام ایک ضابطہ حیات ہے۔ یہ بالکل خیالی اور مبہم تصور ہے۔ کسی دوسرے مذہب یعنی ہندو، عیسائی سے پوچھ لیں، کیا ان کا مذہب صرف رسم و عبادات کا نام ہے۔ وہ کہیں گے نہیں۔ یہ زندگی کے بارے راہنمائی کرتا ہے۔۔ ظاہر ہے، ہر مذہب اپنے ماننے

والے کو زندگی گزارنے کے کچھ اطوار بھی دیتا ہے۔ عام زندگی میں کیا کرنا ہے، اور کیا نہیں کرنا ہے۔ چنانچہ ضابطہ حیات اسلام کی نرالی صفت نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی کوئی حقیقت بھی نہیں۔ کیا مذہبی رسومات اور عبادات اسلام میں نہیں ہیں؟ بالکل ہیں۔ اب دین والی کونسی بات ہے؟ جس سے اسلام کو دوسرے مذاہب سے الگ کیا جاسکے۔ اسلام میں بھی ملائیت ہے۔ احادیث اور روایات ہیں۔ مقدس رسومات اور عبادات ہیں۔ مقدس شخصیات ہیں۔ اسلام ہو یا کوئی اور مذہب اس کی عملی شکل کچھ عقائد، مقدس شخصیات، مذہبی رسومات اور عبادات کا مجموعہ ہی ہوتا ہے۔ اسلام ہمیشہ سے یہی شکلیں رہی ہیں۔ کوئی 'دین' نہیں ہوتا۔ یہ محض ایک فکری دھوکہ ہے۔ پوری اسلامی تاریخ میں نہ اسلام 'ضابطہ حیات' کی شکل میں کبھی ہوا ہے۔ حتیٰ کہ 'ضابطہ حیات' کے الفاظ بھی قرآن میں موجود ہیں نہ کسی روائت میں۔ یہ ایک سیاسی نظام ہے، یہ ایک معاشی نظام ہے وغیرہ بھی ایک نظری دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں پوری اسلامی تاریخ میں کوئی ضابطہ حیات نام کی چیز نظر نہیں آتی۔ سیاسی معاشی نظام کو لے لیں۔ خلفائے راشدین سے زیادہ کون اسلام فہمی میں آگے ہوسکتا ہے۔ حکمران کے انتخاب کا کوئی اصول نام کی چیز نہیں۔ اسی وجہ سے چار میں سے تین خلفا راشدین مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوگے۔ کیا اسے جدید دنیا کے سامنے مثالی سیاسی نظام کے طور پر رکھا جاسکتا ہے۔ ہر ایک کا انتخاب بھی متنازعہ تھا۔ ہر ایک کا معاشی نظام بھی اس وقت کے قبائلی اور ذاتی حالات کے مطابق رہا۔ ذکوہ اور خیرات دینا تو کوئی معاشی نظام نہ ہوا۔ سود کا تصور بھی نہائت قدامت پرستانہ اور قبائلی نوعیت کا ہے۔ آج کے جدید دور میں اس کے کوئی عملی معنیٰ نہیں۔ اسی لئے سب شرعی اور اسلامی بینکنگ کرنے والے اصل میں سود ہی دے رہے ہوتے ہیں ایک نظری فریب پیدا کرکے۔ سود کی شرح اور اسلامی منافع کی شرح ایک ہی ہوتی ہے۔ نہ کسی معاشرے میں ڈھائی فی صد ٹیکس سے معاشی مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب ہو، وہ اپنی عملی شکل میں صرف مذہب ہی ہوتا ہے۔ چند عقائد، چند رسومات، چند عبادات کا نام۔ اللہ اللہ خیر صلہ۔ دین کوئی الگ سے نہیں ہوتا۔ محض فریب دہی اور زیب داستان ہے، صرف ٹرک کی بتی۔

کیا اسرائیل اور پاکستان ایک جیسی نظریاتی مذہبی ریاستیں ہیں؟

آکسفورڈ یونیورسٹی کے تاریخ دان پروفیسر Faisal Devji کی ایک کتاب چھپی ہے۔

Muslim Zion: پروفیسر ڈیوجی کا کہنا ہے۔ اسرائیل کو بنانے والی سیاسی صہونیت کے قائدین سرگرم سوشلسٹ اور سیکولر تھے، جو قدامت پرستی اور جدیدیت کی مخالفت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ یہودیوں کے لئے ایک الگ وطن کا قیام چاہتے تھے لیکن ایک ماڈرن سیکولر پہچان کے ساتھ۔

عام طور پر ہمارے ہاں اس دوسرے حصہ کو نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ اسرائیلی ریاست کا پہلا وزیراعظم ڈیوڈ بن گورین اور پہلا اسرائیلی صدر ڈاکٹر چھیم ویزمین تھا۔ دونوں ہی کٹر سیکولر خیالات کے حامل تھے۔ یاد رہے، کہ اسرائیل کا پہلا صدر بننے کے لئے آئین سٹائین کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ لہذا مذہبی شناخت کا نام اگرچہ پاکستان اور اسرائیل ریاستوں کے قیام میں استعمال ہوا، لیکن پاکستان اور اسرائیل بنیادی طور پر مختلف ریاستیں ہیں۔ اسرائیل میں اس طرح کی تحریکیں رہیں، جو چاہتی تھی، کہ اسرائیل میں ریاستی سطح پر یہودی شریعت نافذ کی جائے۔ لیکن ان کو واضح طور پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ صہونیت، مذہب پر عمل اور یہودی سیاسی شناخت کو دو مختلف چیزیں سمجھتے ہیں۔ یہودی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ یہودی مذہب پر عمل بھی کرے۔ جب کہ پاکستان میں اسلامی نظام اور نفاذ شریعت ایک بنیادی سیاسی نظریہ ہے اور جہاں سیکولر مسلمان ہونا ناممکن بن چکا ہے۔ پاکستان بنانے کا مقصد سیاسی تھا۔ لیکن قائداعظم نے پاکستان کے لئے 40 کی دہائی میں اسلام کا لفظ اس قدر استعمال کیا اور تحریک پاکستان فرقہ وارانہ کریکٹر میں بدل گئی۔ پاکستان میں سیاسی اسلام سے بچنا مشکل ہوگیا۔ چنانچہ اب پاکستانی ریاست میں کسی سیکولر اور لبرل خیال کے امکانات معدوم ہوچکے ہیں۔ شریعت کے نفاذ کے مطالبے پر زور رہا اس کے نتائج کو جانے بغیر کہ یہ پاکستانی معاشرے کو تقسیم در تقسیم کردے گا۔ اس لئے کہ ہر فرقہ کی شریعت الگ ہے۔ سنی شیعہ تقسیم کے بعد تحریک طالبان اپنی طرح کی شریعت لانا چاہتی تھی۔ ان حالات میں پاکستان میں لبرل اور سیکولر آوازیں نحیف ہوچکی ہیں۔ اور جو چند لوگ رہ گے ہیں، ان کو لبرل فاشسٹ کہہ کر بدنام کردیا جاتا ہے۔ چنانچہ پاکستان کے برعکس اسرائیلی قومیت سیکولر، ماڈرن، اور غیر مذہبی ہے۔ سیاسی اسلام اور سیاسی صہونیت میں اپنے اپنے مقاصد میں فرق ہے۔ سیاسی اسلام میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں، جو کوئی اور مذہب یا نظریہ رکھتے ہیں۔ جب کہ سیاسی صہونیت یہودیوں کو محض ایک قوم سمجھتی ہے۔ اس سے قطع نظر ان کا مذہب کے بارے میں کیا رویہ ہے۔

مسئلہ خیر و شر اور مذہب

خیر و شر یا اخلاقیات پر مذہب کا دعویٰ نہایت کمزور ہے۔ کہ وہ انسان کو بہترین اخلاقیات کی طرف گامزن کرتا ہے۔ مذہبی سوال کرتے ہیں، خدا پر ایمان کے بغیر انسان نیکی پر کیسے چلے گا اور اسے بدی سے پاک کیسے رکھا جاسکے گا۔ انہی ایمان یافتہ لوگوں پر نظر ڈال لی جائے یا کوئی بھی مذہب زدہ معاشرہ لے لیا جائے۔ تو آپ کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اخلاقی لحاظ سے مثالی تصویر تو دور کی بات نہایت مایوس کن صورت حال ملے گی۔ "مذہب سے دور قوموں" کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ اخلاقی گراوٹ، منافقت، لوٹ مار، بے ایمانی، بد دیانتی، استحصال، کام چوری، سہل پسندی، جستجو سے عاری، وقت کی قدر سے بے نیاز، اور ذاتی مفادات میں ڈوبی نظر آئیں گی۔ جتنا کوئی پابند مذہب ہوگا۔ سماجی لحاظ سے وہ اتنا ہی ناقابل اعتبار ہوگا۔ آپ مذہبی بندے سے غیر مذہبی شخص کے مقابلے میں زیادہ بے اصولی، اخلاقی گراوٹ، اور خود غرضی کی توقع کرتے ہیں۔ خدا کا محض نام لے کر کسی کو برائی سے بچایا جاسکتا ہے نہ اسے نیکی پر لگایا جاسکتا ہے۔ مذہبی لوگوں کا اپنا عملی کردار ہی اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ مذہب صالح معاشرہ پیدا کرنا تو دور کی بات چند صالح افراد بھی پیدا کرنے میں ناکام ہے۔ پھر دلیل یہ دیتے ہیں، اس میں مذہب کا تو کوئی قصور نہیں۔ لوگ عمل نہیں کرتے۔ سوال یہ ہے، جب آپ ایمان لے آئیں ہیں اور اس پر نہایت سختی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ تو اس پر عمل کرنے سے آپ کو کس نے روکا ہوا ہے اور اگر عمل ہی نہیں کرنا، تو پھر مذہب کو ہر وقت سر پر چڑھانے اور اس کے فوائد گنوانے کا مطلب کیا ہے۔ پہلے اس پر خود تو عمل کر لو۔ اصل میں ناقابل عمل چیز پر ہی عمل نہیں ہوتا۔ مذہب پر ضابطہ حیات کا لیبل جتنا بھی چسپاں کیا جائے، مذہب کا تعلق عقیدے، عبادات، رسومات سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اسی پر لوگ عمل کرتے ہیں۔ مذہب کا اخلاقیات کی سائنس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اسی لئے مذہب میں لوگ ریاکار بن جاتے ہیں۔ اوپر سے تقویٰ پرہیزگاری کا بورڈ لگائے رکھو اور اندر سے دنیا داروں سے بھی بڑھ کر حریص رہو۔ مذہب کو اخلاقیات سے چسپاں اسے اخلاقی جواز عطا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ مذہبی اور الہامی کتابیں بھی اس بات کی گواہ ہیں۔ کہ مختلف انسانی ادوار میں مختلف اور متضاد اخلاقی اصول مروج رہیں۔ وہ بات جو ایک وقت میں نیکی تھی، دوسرے دور میں بدی قرار

پائی۔ اسی طرح ایک خطے کی نیکی دوسرے خطے میں برائی متصور رہی۔ کوئی مطلق نیکی ہوتی ہے نہ مطلق برائی۔ نظام اخلاقیات معاشرے میں توازن، تناسب اور عدل قائم رکھتا ہے۔ اس پر کسی عقیدے کے جملہ حقوق محفوظ کرنے کا دعویٰ غلط ہے۔

مذہبی نہیں مہذب

اگر خدا پر ایمان نہیں ہوگا، تو کیا انسان حیوان ہو جائے گا۔ اگر آپ اپنے ہی پاکستانی ایمانی، اسلامی، مومن و تقویٰ گزار معاشرے کی سرتاپا کرپشن، لوٹ مار کی عادت، منافقت، ریاکاری، ظلم و استحصال، دولت کی کھویا کھوئی۔ رشوت خوری، دکھاوا، سماجی برائیاں، ملاوٹ، جھوٹ کو دیکھ لیں تو اس سوال کی تردید کرنے میں کسی دلیل، تجزیے، ریسرچ، مغز خواری کی ضرورت نہیں۔ ایمان چونکہ بلاسوچے سمجھے لایا جاتا ہے۔ لہذا مذہب سے متعلقہ باتوں پر سوچنے سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ ایک رٹا ہوتا ہے، جس کو لاشعوری پر دہرایا جاتا رہتا ہے۔ مثلاً نماز برائیوں سے روکتی ہے۔ عملی طور پر نماز پڑھنے کی وجہ سے کوئی برائی سے نہیں رکتا۔ نماز کسی بندے کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ کسی تھانے چلے جائیں۔ کسی سرکاری دفتر چلے جائیں۔ آپ کے سامنے نمازیں پڑھنے والے رشوت مانگ رہے ہوتے ہیں۔ عمرے اور حج باز۔ کاروباری معاملات میں جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں۔ اور اپنی چیزوں کو مہنگا اور دھوکے سے دے رہے ہوتے ہیں۔ خانہ کعبہ میں بیٹھ کر پیچھے اپنے ساتھیوں کو کاروباری جھوٹ کی ہدایات دیتے ہیں۔ علمائے دین، پیروں، سیدوں اور ملاؤں کے قریب ہو کر دیکھیں۔ ان میں آپ کو مکاری اور دنیاداری صاف نظر آئے گی۔ مذہب جس جس خوبی کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ دنیا میں عملاً ایمان والوں کے ہاں کہیں نہیں پائی جاتی۔ ساری اسلامی دنیا کے حکمران بشمول محافظ حرمین شریفین عیاش پسند، دولت پسند، جاہ پسند اور قوانین سے مبرا ہیں۔ ہاں خوبیاں نام کی جتنی بھی چیزیں ہیں۔ عام انسان ہوں یا حکمران۔ وہ ان معاشروں اور افراد کے ہاں ملتی ہیں۔ جو سیکولر ہوتے ہیں۔ جو مذہبی نہیں مہذب ہوتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو مذہب کو سر پر نہیں چڑھاتے۔ مذہب عملی طور پر انسان کو جرائم کی طرف مائل کرتا ہے۔ کیونکہ گناہ کرتے جائیں اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بخشواتے جائیں۔ مذہب صرف احساس گناہ پیدا کرتا ہے۔ اور پھر اندھی اطاعت کے بدلے میں ایمان یافتہ کے گناہوں کو معاف کروانے کے آسان نسخے فراہم کر دیتا

ہے۔ثواب اور معافیوں کی ہول سیل اور لوٹ سیل لگادی جاتی ہے۔شیطان کا افسانہ جرائم کی ذمہ داری سے مبرا کر دیتا ہے۔اہل ایمان کے لئے شیطان قربانی کا بکرا ہے۔گناہ کرو، جرم کرو۔کہہ دو شیطان آگیا تھا۔شیطان نے ورغلا دیا۔

خدا پر ایمان ہونے سے بھی انسان حیوان بن سکتا ہے۔مذہبی لوگ اس بات کے لئے چلتے پھرتے زندہ ثبوت ہیں، حج کا انتظام کرنے والے لوگوں سے دھوکہ کر دیتے ہیں۔پاکستان میں غیر سودی شرعی کاروبار کے نام علما اربوں روپے لوگوں کے لوٹ کر بھاگ گئے۔اپنے آس پاس دیکھ لیں۔دلائل ڈھونڈنے کے لئے مغز ماری کی ضرورت نہیں۔چنانچہ عملی مشاہدے اور تجربے سے یہ بات صحیح ثابت نہیں ہوتی کہ خدا پر ایمان نہ ہونے سے انسان بے لگام ہو جاتے ہیں۔پاکستانی عوام اسلام کی محبت میں سرتا پا ڈوبے ہیں لیکن یہ دنیا کی کرپٹ ترین قوموں میں سے ہیں۔جوں جوں پاکستان میں اسلام پسندی بڑی ہے۔کریکٹر، تمیز اور تہذیب میں گراوٹ آئی ہے۔مقدس فریب سے نکل کر اپنی اصلاح کی طرف بڑھا جا سکتا ہے۔

زیادہ مذہبی تعلیم کے نقائص

- مذہبی تعلیم کی وجہ سے آزادی فکر کا بیج نہیں پھوٹ سکتا۔طالب علم زندگی اور کائنات کے محدود اور یک طرفہ نقطہ نظر میں بند ہو جاتا ہے۔
- مذہبی تعلیم سے فرقہ پرستی، کٹر پسندی، عدم برداشت میں اضافہ ہوتا ہے۔
- مذہبی تعلیم سائنسی فکر کو پنپنے سے روکتی ہے۔جو سائنس کے پریڈ میں پڑھایا جاتا ہے۔دینیات کے پریڈ میں وہ سب الٹ دیا جاتا ہے۔لہٰذا سائنسی ذہن نہیں بن پاتا۔
- مذہبی تعلیم کی اپنی افادیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ایک ہی طرح کی باتوں کی تکرار سے لوگ بور ہونے لگتے ہیں۔دینیات کی باتیں ارد گرد کے مادی حالات کے سیاق و سباق میں نہیں ہوتی۔جس کی وجہ سے ان میں فطری دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔مجبوری اور بطور ثواب ان کو سننا ہوتا ہے۔اگر آزادی ہو، 90 فی صد طلبا دینیات کے پریڈ آنا چھوڑ دیں۔یا اس کی افادیت نہ ہونے کی وجہ سے اس مضمون کا انتخاب ہی چھوڑ دیں۔
- مذہبی تعلیم کو حاصل کرنے والے لوگ "تعلیم یافتہ" نہیں۔رٹو (طوطے) ہوتے ہیں۔

مسلمان اور سائنسی تعلیم

مسلمانوں کے سائنس کے بارے میں کچھ یوں رویئے ملتے ہیں:

- اسلام اور قرآن کو سائنس سے ثابت کرتے ہیں۔
- ساری سائنس قرآن سے نکلی ہے، کہتے ہیں۔
- سائنس کی کئی بنیادی باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔نظریہ ارتقا کو نہیں مانتے۔اس کائنات کے بننے کے عمل کو نہیں مانتے۔
- جو ماشااللہ کچھ سائنس "پڑھ" گئے ہیں۔وہ سائنس کی ایسی تاویلیں لاتے ہیں۔اور سائنس کو یوں مسخ کرتے ہیں، کہ وہ غلط ثابت ہو جائے، یا پھر عقیدے سے آن ملے کچھ ایسے مسلمان ہم نے دیکھے، جو بڑی سادہ لوحی سے بڑی ہی بنیادی سائنس کی باتوں کے بارے کہہ دیتے ہیں، کہ سائنس کا کیا ہے، یہ کل خود ہی اپنی کہی بات کی تردید کر دے گی۔اور مذہب کی تائید ہو جائے گی۔

اب ایسے میں مسلمان کا کبھی سائنس کے ساتھ ذہنی رشتہ بن سکتا ہے؟ سائنس ان سے اور یہ سائنس سے اجنبی نہ رہیں گے؟ مطلب کی چیز لے لی، اور باقی رد کر دی۔یہ صرف اپلائیڈ سائنس ہی پڑھ سکتے ہیں۔تاکہ ڈاکٹر، انجینئر بن کر سائنس کے میکینک بن جائیں۔مرمت کا کام کریں۔یا اس سے تخریبی کام کریں۔۔جیسے ایٹم بم بنا لیا۔بجلی نہیں بنا سکتے۔طالبان سے لے کر تمام مذہبی شدت پسند سائنس کے آلات "کا خوب تخریبی فائدہ لے رہے ہیں۔انسانیت کا کچھ بھلا نہیں کر رہے۔یہ ہے اسلام اور سائنس کا رشتہ اکیسویں صدی میں۔

میر جعفر۔۔۔میر صادق کے مسلم سازشی استعارے

مسلم ذہن اور اسلامی نظام کے معاملات سازشی تھیوریوں کے بغیر نہیں چل سکتے۔غیر مسلم سازشیں کر رہے ہوتے ہیں۔یا پھر خود مسلمانوں میں سے کچھ افراد کفار کے ساتھ مل جاتے ہیں۔جو ساری مسلم ناکامیوں کی وجہ ہوتے ہیں۔سازشی تھیوری افراد اور قوموں کو راہ فرار دیتی ہے۔خود احتسابی اور خود تنقیدی سے بچاتی ہے۔چونکہ دعوی ہے، اسلام دنیا کا عظیم ترین نظام اور مسلمان دنیا کی عظیم ترین، حق پر کھڑی واحد امت ہے۔مسلمانی نرگسیت اپنا احتساب کرنے کی جرأت نہیں

کرسکتی۔ ٹیپو سلطان کی شکست کی وجہ ہمیں میر جعفر کی سازش بتائی جاتی ہے۔ جو سلطان کا ہی کمانڈر تھا۔ لیکن یہ نہیں بتایا جاتا۔ ٹیپو سلطان کی شکست میں امیر اور طاقت ور مسلمان نواب آف حیدر آباد دکن کی ٹیپو کے خلاف انگریزوں کی فوجی مدد اور مالی امداد کا دراصل اہم کردار تھا۔ وہ سازش نہ تھی۔ ریاست حیدر آباد دکن کے مسلمان نواب نے کھلم کھلا برطانیہ کا ساتھ دیا تھا۔ اور اپنی فوجیں بھجوائی تھی۔ حیدر آباد دکن ہمسایہ ریاست تھی۔ انہوں نے ٹیپو کی بھاگتی فوج کو اپنی ریاست کے اندر بھی نہ آنے دیا۔ تاریخی حقائق اور تاریخی متن کو ادھورا اور مسخ کر کے پڑھانا۔۔ اور دکھانا۔ ہمارا خاص مسلم مزاج ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے اندر کی سازشوں کا تعلق ہے۔ پوری مسلم تاریخ روز اول سے اپنوں کی سازشوں سے اٹی بھری ہے۔ گویا اسلامی سیاسی نظام اور ان کے اندر کی سازشیں لازم و ملزوم ہیں۔ بجائے اس حقیقت کو ماننے کے انسان، قومیں، افراد، طبقے، قبیلے اپنے اپنے مفادات کے مطابق چلتے ہیں۔ کوئی آفاقی اور آسمانی قدروں کے لئے زندہ رہتا ہے، نہ ان کے لئے لڑتا ہے۔ مسلمان خود کو اور دنیا کو نہیں سمجھ سکتے۔

کیا کرپشن مسئلہ ہے؟

کچھ حلقے کرپشن کو پاکستان کا واحد سب سے بڑا مسئلہ قرار دے رہے ہیں۔ اور یہ خیال پیدا کرتے ہیں، کہ کرپشن کی وجہ سے ہی پاکستان کی ترقی نہیں ہو رہی یا عوام کے مسائل حل نہیں ہو پا رہے۔ یہ اصل میں پاکستان کے دیگر سیاسی، سماجی ریاستی مسائل سے نظر ہٹانے کی تحریک ہے۔ کرپشن ایک تجریدی اصطلاح abstract term ہے۔ ایک نہ دکھائی دینے والا invisible عمل ہے۔ پاکستانی معاشرہ مجموعی اور بنیادی طور پر کرپٹ معاشرہ ہے۔ اس سے آبادی کا کوئی حصہ نہیں بچا ہوا۔ ہمارے جنرل بھی اتنے ہی کرپٹ اور دولت پرست ہیں، جتنے سیاست دان، افسر شاہی یا کاروباری لوگ۔ یہاں کے علمائے دین، پیر، سیدزادے، مولوی سب کرپٹ ہیں۔ کرپشن کی بے شمار قسمیں ہوتی ہیں۔ جب کہ ہم ان کو کرپشن سمجھتے ہی نہیں۔ پھر ہر مسئلہ دوسرے مسئلے سے جڑا ہوتا ہے۔ کسی ایک مسئلے کو سنگل آؤٹ کر کے ٹھیک نہیں کیا جاسکتا، باقی کی ساری صورت حال یوں کی توں رہے۔ کرپشن امیری اور غریبی کے فرق سے جڑا ہوا ہے۔ جن معاشروں میں بے تحاشہ آبادی ہے۔ اور وہ پسماندہ اور عمومی طور پر غریب ملک ہیں۔ قومی دولت کم اور کھانے

والے بے شمار ہیں۔ جہاں آقا اور غلام کے رشتے ہیں۔ ان ممالک اور معاشروں میں کرپشن اعلی سطح پر موجود ہے۔ جو معاشرے ترقی یافتہ ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان معاشروں میں کرپشن کم ترین سطح پر ہے۔ چنانچہ پاکستانی سوسائٹی کا کرپٹ ہونا کوئی غیر فطری چیز نہیں۔ یہ کھو یا کھوئی والا معاشرہ ہے۔ جس کی جتنی ہمت ہے۔ آگے بڑھ کر دولت بنانے والے مواقع ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ دنیا کے تمام ترقی یافتہ معاشروں کی جب حالت ہماری جیسی تھی۔ وہ بھی اسی طرح کرپٹ تھے۔ کرپشن سماجی سائنس کا مسئلہ ہے اور قانونی مسئلہ ہے۔ پاکستان میں کرپشن کے قوانین امکانی طور پر دنیا کے سخت ترین قوانین میں ہونگے۔ کرپشن کو ہینڈل کرنے والے ادارے بھی درجنوں کے حساب سے ہیں۔ ایک کرپشن کے ادارے پر دوسرا کرپشن کا ادارہ ہے۔ نتیجہ بہت ہی کم۔ کہتے ہیں، سفید کالر کرپشن کو پکڑنا نہائت مشکل ہے۔ کرپشن کرنے اور کرپشن کی حفاظت کا ایک جال ہے۔ ہم جب تک کرپشن کے ایشو کو سائنسی لحاظ سے سمجھنے کی کوشش نہ کریں گے۔ طاقت ور کرپٹ رہیں گے، اصلاح کے عمل ہمیں ایک ساتھ شروع کرنے ہونگے۔ ایک عمل کو جب تک ہم دوسرے عمل پر ترجیح دیتے رہیں گے۔ مسائل کا چیستان کبھی حل نہ کر پائیں گے۔ کوئی اسلام کے نام پر، کوئی جمہوریت کے نام پر، کوئی حب الوطنی کے نام پر، کوئی کرپشن کے نام پر ہم کو لوٹ رہا ہے۔ عوام فٹ بال بنیں ہوئے ہیں۔ کرپشن کا حل کثیر الجہت ہے۔ یہ جمہوری پراسس سے جوڑا ہوا ہے۔ جمہوریت کے دو تین بنیادی ستون ہوتے ہیں۔ عوام اپنے حکمرانوں کو خود منتخب کریں، اور خود ووٹ کے زریعے نکالیں۔ یہ عمل بغیر مداخلت کے ہونا چاہئے۔ اس عمل سے نااہل، خدمت نہ کرنے والے اور کرپٹ عناصر فلٹر ہوتے جاتے ہیں۔ جموریت قانون کی حکمرانی کا نام ہوتا ہے۔ جو ہمارے ہاں ناپید ہے۔ قانون کی حکمرانی نے بھی جمہوری عمل سے ہی مستحکم ہونا ہے۔ پارلیمنٹ سے بہتر قوانین اور بہتر ادارے بنتے جائیں۔ جمہوریت میں احتساب کا عمل inbuilt ہوتا ہے۔ عوام اپوزیشن پارٹیوں کے شکل میں مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ جمہوری عمل معاشرے کو مہذب بناتا جاتا ہے۔ صاحبان اختیار کو جواب دہ کرتا ہے۔ ہو یہ رہا ہے سیکورٹی اسٹیبلشمنٹ پاکستان کو جمہوریت کی پہلے زینے یعنی ووٹ کے زریعے حکومت کے بدلنے کے عمل سے ہی آگے جانے نہیں دے رہی۔ پاکستان کا مسئلہ کرپشن نہیں۔ ترقی کے عمل کا نہائت سست ہونا ہے۔ ترقی معاشروں میں آل راونڈ تبدیلیاں پیدا کرتی ہے۔ بہتری کا سائکل چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ پاکستان کی ترقی آپ کی ریاستی پالیسیوں اور

ترجیحات نے روکی ہوئی ہے۔آپ کو مذہبی جنونیت چھوڑنی ہوگی۔آپ کو ہمسائیوں سے پرامن رہنے کو ترجیح دینی ہوگی۔تیز تر ترقی کے لئے آپ کو اپنے سیکورٹی اور دفاعی مسائل کم کرنے ہونگے۔ ہمیں اپنے ذہنوں کو بدلنا ہوگا۔کرپشن کو ختم کرنے کے لئے آپ کو تہذیب کے راستے پر چلنا ہوگا۔ ہم کچھ بھی بدلے بغیر مسائل کا حل چاہتے ہیں۔یہ غیر سائنسی غیر منطقی رویہ ہے، چنانچہ آپ کی سب کوششیں اور خواہشیں بے نتیجہ رہتی ہیں۔ہر کوئی اپنے داو پر ہے۔ہر کوئی اپنا وقتی فائدہ لے رہا ہے۔ ہر کوئی سمیٹ کر نکل رہا ہے۔عوام کے لئے ٹرک کی بتی کے پیچھے گول گول گھومنا رہ گیا ہے۔

پاکستان کی آزادی کے لئے قربانیاں دی گئیں؟

تحریک پاکستان آزادی کی نہیں تقسیم ہند کی تحریک تھی۔آزادی برصغیر کو بہر حال مل رہی تھی۔اسے آزادی کہیں یا تقسیم، اس کو برٹش حکومت، کانگریس، اور قائد اعظم آئینی اور قانونی سیاسی طریقے سے حاصل کر رہے تھے۔اس کے لئے "قربانیوں" کی کوئی ضرورت تھی نہ کوئی تعلق۔قربانیاں ہندوؤں، سکھوں کو پاکستانی مسلم اکثریتی علاقوں سے نکالنے کے لئے دی گئیں۔جو ہزاروں سال سے اس دھرتی کے باشندے تھے۔اور معاشی، ملکیتی، تعلیمی، ہنر مندی میں مسلمانوں سے برتر زندگی گزار رہے تھے۔اور اس کے بدلے میں ہندو اور سکھ اکثریتی والے علاقوں سے مسلمانوں کو نکالا یا مارا گیا۔چنانچہ قربانیاں آزادی یا تقسیم کے لئے نہ تھی۔کھونے، لوٹنے، قبضہ کرنے کے لئے تھی۔یہ سب "قربانیاں" نہ بھی ہوتی، پاکستان تب بھی بن رہا تھا اور کراچی والے مہاجر حضرات جو پاکستان کے بننے کے 15 سال بعد تک بھی آتے رہے۔پاکستان بن جانے کے بعد کی ہجرت کو بھی "قربانیوں" میں شامل کرتے ہیں۔

متفرق مضامین:

مذہب انسان کو مادی حقیقت سے لاتعلق کرتا ہے۔پہلے اسے اپنی ذات سے، اپنے جسم سے، اپنے دماغ سے نفی کرواتا ہے۔پھر دنیا کی تمام مادی حقیقتوں سے نفی کروا دیتا ہے۔جس چیز کا وجود نہیں وہ حقیقت بن جاتا ہے، اور جو سامنے کی حقیقت ہے۔اس کی نفی ہو جاتی ہے۔چنانچہ مذہبی بالکل ادراک نہیں کر پاتے۔کہ تصور اور حقیقت میں کیا فرق ہے۔ثواب، دعائیں،

رحمتیں، برکتیں، تصوراتی جنت، جعلی مذہبی تاریخ میں انسان کو گم کر دیا جاتا ہے۔جب کہ ننگی حقیقتیں تصور بن جاتی ہیں۔

سماج اور ماحول کا پریشر ہوتا ہے۔بول کوئی سکتا نہیں۔اپنی عزت اسی میں ہوتی ہے فریب نظر کو ہی حقیقت مانتے جائیں۔

پاکستانی معاشرہ مذہبی آندھیوں اور طوفانوں میں پھینکا جا چکا ہے۔ریاستی نظریہ اسلامسٹ ہے، ہماری فوج پاکستان کو اسلام کا قلعہ اور خود کو اسلام کا محافظ کہتی ہے، جہاد اس کا سرکاری نعرہ ہے۔ان گنت مذہبی تنظیمیں ہیں، مختلف اسلامی عقائد کے، جن کے ممبران کی تعداد لاکھوں اور کروڑوں میں ہے۔وہ ہر وقت اپنے پیروکاروں پر مذہبی عقائد کی بارش کرتے رہتے ہیں۔تبلیغی جماعت، مدنی گروپ، وہابیوں، سنیوں، شیعیوں، احمدیوں کی مذہبی جماعتیں، پھر مذہبی سیاسی جماعتیں، لاکھوں کی تعداد میں مسجدیں، مذہبی مدرسے اور پھر روز کی پانچ وقت نمازیں، ہفتہ وار جمعہ، سال میں رمضان کا پورا مہینہ، محرم کا مہینہ، حج اور عمرے، نصابی کتابیں، میڈیا۔سب مذہب مذہب کی پکار کر رہے ہیں۔یہ جدید اکیسویں صدی کا دور ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں پاکستانی معاشرے کا اس طرح قدامت پرستی، رجعت پسندی، جدیدیت دشمنی میں چلے جانا، کامن سنس اور عقل کی موت۔کا معاشرہ بن جانا۔خوفناک تصویر ہے۔یہ معاشرہ اپنے کسی خوفناک انجام سے دوچار ہو جائے گا۔اس کی حکمران اشرافیہ جیسی اندھی شاہ ہی دنیا میں کسی قوم کو میسر آئی ہو۔پاکستان وقت اور تاریخ کے بہاؤ سے باہر جا چکا ہے۔

اس ملک کے عوام کو اچھی زندگی کے لوازمات درکار ہیں۔نوجوانوں کو تعلیم اور روزگار چاہئے۔ان کو ہنستا کھیلتا، خوشحال پاکستان چاہئے۔جو اندرونی اور بیرونی امن (سیکورٹی) کی ضمانت کے بغیر ممکن نہیں۔ہمارے دفاعی اور سیکورٹی کے ادارے قوم کو امن فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔کیا پاکستان کے نااہل ترین ادارے۔سیکورٹی کے ادارے نہیں؟ ان کو جس مقصد کے لئے بنایا گیا، یعنی ملک کو تحفظ اور امن فراہم کرنا۔انہوں نے ان مقاصد کو کبھی حاصل نہیں کیا۔ہمارے دفاعی ادارے خارجہ پالیسی کو بھی کنٹرول کرتے ہیں۔لیکن ہمارے علاقے اور دنیا میں دوست کم اور دشمن زیادہ ہیں۔مستقل بدامنی اور بیرونی خطرات پاکستان کا مقدر ہیں۔ان

اداروں کی موجودگی میں پاکستان کو مستقل اندرونی اور بارڈرز پر عدم سلامتی ملی ہے۔

ہمیں خوشحالی مانگنے سے پہلے۔ اپنے دفاعی اداروں اور جنرلوں کو مجبور کرنا ہوگا۔ ہمیں امن کے حالات دو۔ ہم پاکستانی جنگ، نفرت اور دہشت گردی کا نام نہیں سننا چاہتے۔ بہت ہوگئی۔

جنگ کے دوران پاکستانی صحافت کا کردار

پاکستانی قوم کو اپنے مستقبل کا اندازہ کر لینا چاہئے۔ اگر روحانی فوج اور مقدس ہستیوں نے ہی لڑنا ہے۔ تو فوج پر اتنا خرچ کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔؟

ستمبر 1965 کی جنگ میں رونما ہونے والے روحانی واقعات ایک شخص نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو خواب میں دیکھا کہ وہ مجاہدین میں اسلحہ تقسیم فرما رہے ہیں۔

(روزنامہ کوہستان لاہور 1965-11-10)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے دربار کے ایک مجاور نے کہا۔
جس رات کو پاکستان پر حملہ ہوا ہے گنبد کے اندر سے ''حی علی الجہاد'' کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

(ہفت روزہ قومی دلیر 1965-11-8)

فوجیوں کا بیان ہے کہ اُنہیں بزرگوں پر اعتقاد نہیں تھا لیکن! اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے سیالکوٹ کے محاذ پر ایک بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کو گھوڑے پر سوار ہوکر لڑتے اور ان کی سیف (یعنی تلوار) پر لکھا تھا۔
شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔ ''اس قسم کے متعدد واقعات مشہور ہیں۔''

(روزنامہ جنگ 1965-10-24)

پاکستان افواج نے اللہ اکبر، یارسول اللہ اور یا علی کے نعرے لگاتے ہوئے بھارتی ٹڈی دل فوج کو بری طرح شکست دی ہے۔

(روزنامہ جنگ کراچی 12 اکتوبر 1965ء)

اس معرکہ میں نبی آخر الزمان ﷺ اور حضرت علی شیر خدا کرم اللہ وجہہ

الکریم (مع اولیاء کرام) اپنے مجاہدوں کے سروں پر موجود تھے۔

(روزنامہ جنگ کراچی 12 اکتوبر 1965ء)

سو میل لمبے محاذ پر سبز کپڑوں والے مجاہد سفید لباس میں ایک بزرگ اور گھوڑے پر سوار دیکھے گئے۔

(روزنامہ جنگ کراچی 12 اکتوبر 1965ء)

چونڈہ کے نزدیک ایک نورانی گروہ کو مہاجرین کی امداد کرتے ہوئے مجاہدین کے ساتھ یارسول اللہ مدد کے نعرے لگاتے ہوئے دیکھا گیا۔

(روزنامہ جنگ کراچی 12 اکتوبر 1965ء)

سرگودھا کے ہوائی اڈے پر ایک بزرگ اپنی جھولی میں بم لیتے ہوئے دیکھے گئے۔ (روزنامہ جنگ کراچی 12 اکتوبر 1965ء)

راولپنڈی 24 اگست مظفر آباد سے اطلاع ملی ہے کہ کل رات بھارتی فوج نے چناری سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو مجاہدین نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ بتایا گیا ہے کہ مجاہدین یا علی کا نعرہ لگا کر آگے بڑھے تو ایک بھارتی سپاہی رام چرن دہشت سے وہیں گر کر ہلاک ہوگیا۔

(روزنامہ جنگ کراچی 12 اکتوبر 1965ء)

امریکی غلامی میں جانے اور ان سے امداد کی درخواست قائداعظم نے پاکستان بننے کے دو ہفتے بعد کر دی تھی۔ تشکیل پاکستان سے ساڑھے تین ماہ قبل یکم مئی 1947 قائداعظم نے امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے دو نمائندوں سے ملاقات کی۔ اور مستقبل میں پاک امریکہ تعلقات کے معاملات کو طے کیا۔ بابائے قوم نے امریکی سفارت کاروں کو یقین دلایا کہ آزاد پاکستان امریکہ کے مفاد میں ہوگا۔ مسلمان ممالک متحد ہوکر روسی جارحیت کا مقابلہ کریں گے۔ (امریکی خدمت میں)۔ قائداعظم نے زور دیا، روسی خطرے کے ساتھ مشرق وسطی کو ہندو سامراج کے غلبے سے بچانے کے لئے پاکستان کا قیام ضروری ہے۔ 14 اگست 1947 جب قائداعظم دہلی سے کراچی روانہ ہوئے۔ تو ان کو الوداع کہنے کے لئے امریکی سفیر موجود تھے۔ پاکستان کے قیام سے دو ہفتے بعد وزیر خزانہ نے

امریکی امداد کی درخواست کی۔ ابتدائی دنوں میں پاکستان انتہائی مالی مشکلات کا شکار تھا۔فوج اور سرکاری ملازمین کو تنخوائیں دینے کے لئے پیسہ موجود نہیں تھا۔قائداعظم کے نمائندے فیروز خان نون نے ترکی میں امریکی سفیر کو یقین دلایا پاکستان کے مسلمان کمیونزم کے خلاف ہیں۔ہندوؤں نے نہرو کی بہن کو روس میں سفیر مقرر کر دیا ہے۔اور ہمارے ابھی روس سے کوئی سفارتی تعلقات نہیں۔ پاکستان امریکہ کی منڈی بن سکتا ہے۔لہٰذا امریکہ پاکستان کو مالی امداد دے۔

یہ تھی قائداعظم کی خارجہ پالیسی اور دنیا سے تعلقات کا وژن۔امریکہ کی خدمت اس کا بنیادی مرکز تھا۔اور پھر پاکستان نے 66 سال میں امریکہ کی بس خدمت ہی کی۔جس کے لئے یہ بنایا گیا تھا۔ پاکستان کے پاس فوجیوں اور سرکاری ملازموں کو تنخواہ دینے کے پیسے نہ تھے۔لیکن قائداعظم نے کشمیر پر حملہ کرنے کا حکم جاری کر دیا۔جب کہ کشمیر کا فیصلہ برٹش، انڈیا، کشمیری راجہ کے ساتھ بذریعہ بات چیت طے کرنا تھا۔

''بھارت نے پاکستان کو دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔''

یہ وہ فقرہ ہے، شاہد ہی کوئی پاکستانی ہو جس کے کانوں اور آنکھوں سے یہ فقرہ نہ ٹکرایا ہو۔

لیکن یہ سنتے سنتے جب ہمارے شعور کی آنکھ کھلی، تو سوچا۔ہم پاکستانیوں نے بھارت کو بھلا کب دل سے تسلیم کیا ہے۔؟ ہم نے بھارت کی بربادی اور اس پر فتح حاصل کرنے کی ہمیشہ چاہ کی ہے۔ ہر جمعہ کے خطبے میں بھارت کی تباہی کی دعائیں مانگی ہیں۔ ہر نئی نسل کو بھارت سے نفرت اور دشمنی کا سبق نصاب اور میڈیا کے ذریعے دیتے ہیں۔ بھارت نے پاکستان کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا اس دعویٰ اپنے آپ سے دھوکا کرنا ہے۔

پاکستان یہ کہہ کر بنایا گیا تھا۔ہم مسلمان ہندوؤں کے ساتھ امن سے نہیں رہ سکتے۔لیکن پاکستان بنانے کے بعد ہم نے ثابت کیا۔کہ ہم علیحدہ رہ کر بھی امن سے نہیں رہ سکتے اور ہندوستان کے ساتھ تو بالکل ہی نہیں۔ہندو ہمارا ازلی دشمن ہے۔کیا ایسی مستقل پالیسی پاکستان بنائے جانے کے مقاصد کی نفی نہیں؟

● ● ● ● ●

تصورِ خُدا
ارشد محمود